مطالعۂ ادب

(حصّہِ دوم)

برائے زبانِ دوم اُردو

بی۔اے، بی۔ایس سی، بی۔کام (سال دوم)

مُرتّبہ

شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

ناشر: اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش، حیدرآباد

Scanned by CamScanner

مطالعۂ ادب

(حصۂ دوّم)

برائے

بی۔اے، بی۔ایس۔سی اور بی۔کام (سالِ دوم)

اُردو (زبانِ دوم)

مُرتّبہ

شعبۂ اُردو۔جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

ناشر

اُردو اکیڈیمی۔آندھرا پردیش۔حیدرآباد

Scanned by CamScanner

© جملہ حقوق بحق اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش محفوظ ہیں

زیرِ سرپرستی

محمد رحیم الدین انصاری

صدر نشین اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش

پہلا ایڈیشن: جولائی 2009ء

تعداد : 1,000 (ایک ہزار)

قیمت : ۲۵ روپے -/Rs. 25

طباعت : شارپ کمپیوٹرس، حیدرآباد۔ 9392427796

کمپوزر : ابوزاہد شاہ سید وحید اللہ حسینی القادری الملتانی

ناشر : اُردو اکیڈیمی۔ آندھرا پردیش

حج ہاؤز۔ چوتھی منزل۔ نامپلی۔ حیدرآباد

فون 23237810 - 23237995

ملنے کے پتے

- دفتر اُردو اکیڈیمی۔ حج ہاؤز۔ چوتھی منزل۔ نامپلی۔ حیدرآباد۔
- اُردو اکیڈیمی۔ سنٹرل لائبریری۔ نزد قدیم کمشنر آفس۔ پرانی حویلی۔ حیدرآباد۔

Scanned by CamScanner

مطالعۂ ادب

(حصۂ دوّم)

برائے زبانِ دوم اُردو

بی۔اے، بی۔ایس۔سی اور بی۔کام (سالِ دوم)

ادارتی بورڈ

پروفیسر مجید بیدار

چیرمین بورڈ آف اسٹڈیز اُردو۔جامعہ عثمانیہ۔حیدرآباد

مشیران گرامی

- **پروفیسر عبدالستار دلوی** سابق صدر شعبہ اُردو ممبئی یونیورسٹی۔ممبئی
- **پروفیسر فاطمہ بیگم** صدر شعبہ اُردو۔جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
- **پروفیسر میمونہ** سابق صدر شعبہ اُردو۔جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
- **پروفیسر تاتار خاں** شعبہ اُردو۔جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
- **پروفیسر عطیہ سلطانہ** شعبہ اُردو ویمنس کالج۔کوٹھی۔حیدرآباد
- **ڈاکٹر ایس۔اے شکور** ریڈر شعبہ اُردو۔نظام کالج۔حیدرآباد
- **ڈاکٹر عسکری صفدر** ریڈر شعبہ اُردو۔گورنمنٹ ڈگری کالج۔حسینی علم حیدرآباد
- **ڈاکٹر عابد النساء بیگم** پرنسپل وریڈر شعبہ اُردو سگنوڈیا ڈگری کالج۔پتھر گٹی۔حیدرآباد
- **مرزا مصطفیٰ علی بیگ** لکچرر گورنمنٹ ڈگری کالج حسینی علم (برائے خواتین)

Scanned by CamScanner

فہرست

				صفحہ نمبر
حصہ نظم				
ا۔	مثنوی	امن نامہ	از جاں نثار اختر	08
۲۔	قصیدہ	در شانِ حمید الدولہ	از ذوق دہلوی	14
۳۔	مرثیہ	گرمی کا سماں	از میر انیس	18
۴۔	رباعیات			24
ا۔	انیس	ا۔ پرساں کوئی کب جوہر ذاتی کا ہے ۲۔ دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی		24
۲۔	حالی	ا۔ دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو ۲۔ یارو نہیں وقت آرام کا یہ		24
۳۔	رواں	ا۔ افلاس اچھا نہ فکرِ دولت اچھی ۲۔ آزادِ ضمیر ہوا، فقیری یہ ہے		25
۴۔	امجد	ا۔ کوشش ہے اپنی تمام ستائش کے لیے ۲۔ کم ظرف اگر دولت وزر پاتا ہے		25
۵۔	قطعات			28
ا۔	اکبر	چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا		28
۲۔	علامہ اقبال	اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے		29

حصہ نثر

ا۔ داستاں۔	انتخابِ سب رس	از ملا وجہی	33
۲۔ ناول۔	نصوح اور سلیم کی گفتگو	از ڈپٹی نذیر احمد	42
۳۔ انشائیہ۔	ذوقِ چائے نوشی	از ابوالکلام آزاد	50
۴۔ خطوط۔	مکتوباتِ صفیہ	از صفیہ اختر	56
۵۔ مضمون۔	قدیم اُردو (دکنی) میں نیچرل شاعری	از نصیر الدین ہاشمی	62
۶۔ طنز و مزاح	مردہ بدست زندہ	از مرزا فرحت اللہ بیگ	70
۷۔ رپورتاژ	کل ہند کانفرنس	از اظہار اثر	79

Scanned by CamScanner

پیش لفظ

زبان اور ادب کی تدریس کے سلسلہ میں کوئی بھی نصابی کتاب صرف تفہیم وترسیل کا حق ہی ادا نہیں کرتی بلکہ طلباء کی علمی استعداد بڑھانے اور ادب کے شعری ونثری اصناف سے واقفیت اور ان کے تدریجی ارتقا سے آگاہی دینے کا حق بھی ادا کرتی ہے۔ بلاشبہ اس کام کی انجام دہی کے لیے مشاورتی مجلس کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ ''مطالعۂ ادب'' کی جلد دوم کی ترتیب کا کام مشاورتی اساس پر انجام دیا جارہا ہے۔ زبانِ دوم کے لیے مرتب شدہ اس کتاب میں ایسی ہی دلچسپ شعری اور نثری اصناف کے تعارف اور ان کے تدریجی ارتقا پر توجہ دی گئی ہے جس کے مطالعہ کے ذریعہ طلباء کے علمی اور ادبی تناظر میں اضافہ کا قوی امکان ہے۔ اس کتاب کی ترتیب کے دوران پہلی مرتبہ ادب اور ادبی تاریخ سے رغبت پیدا کرنے کے لیے طلبہ میں خُود نویسی کی صلاحیتوں میں اضافہ کرنے کے لیے مواد فراہم کیا گیا ہے۔ ہر صنفِ ادب کا تعارف اور اس کے اجزاء واقسام کے ساتھ ساتھ اس صنف کے عہد بہ عہد ارتقا کے جائزہ کو نصاب کے تعارف میں شامل کیا گیا ہے۔ بلاشبہ کسی صنف کے فنی اور تاریخی ارتقاء پر نصاب میں کوئی سوال پیش نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کا شمولیت صرف صنف کی تفہیم اور اس کے ارتقاء سے طلباء کے ذہن کو ہم آہنگ کرتا ہے۔ توقع ہے کہ نصابی کتاب میں اس قسم کی اولین کوشش کو ضرور ستائش کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

''مطالعۂ ادب'' جلد دوم میں پانچ شعری اصناف اور تقریباً پانچ نثری اصناف کے تعارف اور تاریخ کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں تاریخی ترتیب ہی نہیں بلکہ ہر عہد کی اہم صنفی اور فنی خصوصیات سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اس تعارف کے انداز سے اساتذہ کو معاون اور مددگار مواد فراہم ہوجائے گا۔ جس کی مدد سے تدریس اور تفہیم میں بھی آسانی کا موقع ملے گا۔ ''مطالعۂ ادب'' جلد دوم میں اس قسم کا مواد شامل کرکے کسی قسم کا تجربہ نہیں کیا جارہا ہے بلکہ اس کے ذریعہ طالب علم کے ذہن کو کسی صنف یا موضوع سے متعلق اضافی مواد حاصل کرنے کی ترغیب دلانے کے مقصد سے یہ کام انجام دیا جارہا ہے تاکہ معلومات کے سیلاب کے اس دور میں اُردو زبان وادب کا طالب علم کبھی خود کو کمتر محسوس نہ کرسکے۔

Scanned by CamScanner

جس نصاب میں طلباء کی صلاحیتوں اور معلومات میں اضافہ کرنے کا مواد شامل ہو ہے۔اسے بلا شبہ بہتر نصاب کا درجہ دیا جاتا ہے۔اسی مقصد کے حصول کے لیے زبان دوم اُردو کی اس کتاب کی ترتیب عمل میں لائی جارہی ہے۔اس کتاب کے ذریعے کسی بھی صنف اوراس کے ارتقاء کے بارے میں نہ تو اساتذہ کو تشنگی کا احساس ہوگا اور نہ ہی طلبہ کو کتاب سے استفادہ کے بعد کسی قسم کی کم مائیگی کا شکوہ رہے گا۔یعنی کتاب کی ترتیب کا اہم مقصد ہی ہر صنفِ شعروادب کے بارے میں درکار معلومات کو پیش کر کے طلبہ کی ذہنی سطح بلند کرنا اور انہیں مطالعہ اور استفادہ کی جانب متوجہ کرنا ہے۔گریجویشن کے سالِ دوم کی زبانِ دوم کی یہ کتاب اپنی نہج کے اعتبار سے اس لیے منفرد ہے کیونکہ اس قسم کے صنفی اور تاریخی تعارف کے انداز کو روا رکھتے ہوئے سارے برصغیر میں کوئی بھی نصابی کتاب ابھی تک شائع نہیں کی گئی۔توقع ہے کہ اس ایجادِ بندہ کی ضرور ستائش کی جائے گی۔مجلس ادارت میں شامل تمام مرد وخواتین نے کتاب کی ترتیب کے لیے اپنے مشوروں سے نوازتے ہوئے ہر صنف کے تعارف کا موقع فراہم کیا جس کے لیے ادارتی بورڈ کا حد درجہ مشکور ہوں اور اس کتاب کی اشاعت کے لیے اُردو اکیڈمی آندھراپردیش کے صدر نشین الحاج رحیم الدین انصاری کا بھی دل کی گہرائیوں سے شکر گذار ہوں کیونکہ اسی ادارہ کے مالی تعاون کے نتیجہ میں اس کتاب کی اشاعت کا موقع فراہم ہورہا ہے۔اساتذہ، طلباء اور ادب دوستوں سے توقع ہے کہ ایک نئے انداز سے نصابی کتاب کی ترتیب پر وہ ضرور مشوروں اور نیک تمناؤں سے نوازیں گے۔

مورخہ یکم جون 2009ء

بروز پیر

فقط

پروفیسر مجید بیدار

چیرمین بورڈ آف اسٹڈیز ان اُردو

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

حصۂ نظم

Scanned by CamScanner

مثنوی

عربی لفظ مثنیٰ بمعنی نقل یا پھر مثنیہ بمعنی دہرانا یا دو کرنا سے مشتق لفظ مثنوی اُردو شاعری میں ایک صنف کا درجہ رکھتی ہے۔ کسی قصہ، کہانی، واقعہ یا معاملہ کو تسلسل کے ساتھ نظم کیا جائے اور ہر شعر میں یہ لحاظ رکھا جائے کہ قافیہ ردیف الگ الگ ہو تو ایسی شاعری مثنوی کہلاتی ہے۔ مثنوی کے لیے شاعری کے بحر کے سات اوزان مقرر ہیں۔ اُردو مثنوی کے دو بڑے شاعر میر حسن اور دیا شنکر نسیم نے بحر ہزج محذوف میں ''سحر البیان'' اور ''گلزار نسیم'' مثنویاں لکھی ہیں۔ مثنوی ایک ایسی شاعری ہے جس میں کوئی بھی قصہ ترتیب وار نظم کیا جاتا ہے۔ مثنوی لکھنے کے لیے زور بیان اور منظر نگاری کے علاوہ کرداروں کی پیشکشی کے عمدہ انداز کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو شاعر کردار نگاری، منظر نگاری اور بیان کے عمدہ اظہار پر قدرت رکھتا ہے وہی مثنوی لکھنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ ✪✪

مثنوی کے اجزاء

روایتی مثنوی نگار شعراء نے اس صنف کے لکھنے کے لیے آٹھ چیزوں کو ضروری قرار دیا۔ جسے بنیاد بنا کر مثنوی لکھی جاتی رہی۔ بعد میں ان اجزاء سے علحدگی اختیار کی گئی۔

۱۔حمد ۲۔نعت ۳۔منقبت ۴۔مناجات ۵۔مدح شاہ ۶۔سبب تالیف ۷۔آغاز قصہ ۸۔اختتام

ایک مثنوی چونکہ کسی نہ کسی قصہ یا واقعہ پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے اُردو کی بیشتر مثنویاں داستانوں کی بنیاد پر لکھی گئیں۔ انہیں منظوم داستانیں بھی کہا جاتا ہے۔ ایسی مثنویوں میں مافوق الفطرت عناصر، جادو اور سحر، انہونے واقعات، عجیب وغریب مخلوقات اور عقل میں نہ

تاریخی جائزہ

قدیم دور سے ہی اُردو میں مثنوی نگاری کا سلسلہ جاری رہا۔ بہمنی دور کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کو اُردو کی پہلی دریافت شدہ مثنوی کا موقف حاصل ہے۔ جب بہمنی دور کا خاتمہ ہوا تو عادل شاہی اور قطب شاہی دور نے دکنی زبان کی سرپرستی کی۔ جس کی وجہ سے طویل مثنویوں کی روایت کا آغاز ہوا۔ قطب شاہی دور میں مذہبی مثنوی ''یوسف زلیخا'' مولف شیخ احمد وجود میں آئی۔ ملا وجہی نے مثنوی ''قطب مشتری'' تحریر کی۔ اس کے علاوہ ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' مشہور ہوئی۔ غواصی کی ''طوطی نامہ'' جنیدی کی ''ماہ پیکر'' اور ابن نشاطی کی ''پھولبن'' گولکنڈہ کے قطب شاہی دور سے وابستہ مشہور مثنویاں ہیں جن میں دکنی لب ولہجہ کا اثر ہے اور یہی اثر عادل شاہی دور میں بھی نمایاں

آنے والے قصوں کی کثرت دکھائی دیتی ہے۔ ایسی مثنوی کو داستانوی مثنوی کہا جاتا ہے۔ اُردو کی بیشتر مثنویاں داستانوں مثنویوں میں شامل ہیں جیسے ''سحر البیان'' اور گلزارِ نسیم مکمل طور پر داستانوی مثنویاں کہلائی جاتی ہیں۔

انسانی کرداروں میں عشق و محبت کے ذکر سے وابستہ مثنویاں ''عشقیہ مثنوی'' کہلاتی ہیں۔ یوسف زلیخا، قطب مشتری وغیرہ اُردو کی عشقیہ مثنویاں ہیں ایسی مثنویوں میں بھی مافوق الفطرت عناصر کا ذکر موجود ہوتا ہے۔

مثنوی کی صنف میں تبدیلی اس وقت پیدا ہوئی جب شاعروں نے مافوق الفطرت عناصر اور ماورائی باتوں کو نظر انداز کرکے زندگی کی حقیقتوں اور مسائل کو جب مثنوی سے مربوط کرکے نمایاں کیا گیا تو جدید مثنوی کا وجود ہوا۔ خدا اور بندہ کے رشتہ کو نمایاں کرنے کے لیے ''متصوفانہ مثنویاں'' لکھی گئیں۔ شریعت نامہ، سہاگن نامہ وغیرہ متصوفانہ مثنویاں ہیں۔ کسی مثنوی میں مذہبی قصہ نظم کیا جائے تو وہ مذہبی مثنوی کہلاتی ہے۔ حالاتِ حاضرہ اور مسائل سے وابستہ مثنوی ''جدید مثنوی'' کہلاتی ہے جس کی بنیاد مولانا حالی نے ''بیوہ کی مناجات'' اور ''چپ کی داد'' کے ذریعہ رکھی۔ جاں نثار اختر کی ''امن نامہ'' کیفی اعظمی کی ''خانہ جنگی'' اور علی سردار جعفری کی ''جمہور'' کو حالاتِ حاضرہ کی مثنویوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مثنوی کا دور ختم ہوا لیکن جدید مثنوی کی روایت آج بھی جاری ہے۔

ہوتا ہے۔ نصرتی کی ''گلشنِ عشق''، رستمی کی ''خاورنامہ'' دولت کی ''بہرام وگل اندام'' نصرتی کی ''علی نامہ'' شاہ ملک کی ''شریعت نامہ'' وغیرہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے دکن میں مثنوی نگاری کی روایت کا آغاز ہوا۔

دلی میں اُردو مثنوی کی روایت عروج پر رہی۔ دکن میں ہزارہا اشعار پر مشتمل مثنویاں لکھی گئیں جبکہ دلی میں مختصر مثنویوں کا چلن عام رہا۔ میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' سے مختصر مثنوی کی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کی تقلید لکھنو میں بھی کی گئی۔ خواجہ میر درد کے بھائی میر سوز کی مثنوی بھی دہلی کی یادگار ہے۔ دہلی میں عشقیہ مثنویوں کو پیش کرنے والے شعراء میں میر تقی میر، مومن خاں مومن، شوق دہلوی وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے۔ محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے ''انجمنِ پنجاب'' کے ذریعہ مثنوی کی صنف میں تبدیلی لائی اور ''حبِ وطن'' کے علاوہ ''برکھارت'' لکھ کر مثنوی کو نظم کی طرز میں نمایاں کیا۔ جس کی نمائندگی اسمٰعیل میرٹھی اور علامہ اقبال کے کلام میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

لکھنو کی سب سے اہم مثنوی ''گلزارِ نسیم'' دیا شنکر نسیم کی یادگار ہے۔ شوق لکھنوی کی مثنوی ''زہر عشق'' اُردو کی پہلی زمینی عشق کی مثنوی قرار دی جاتی ہے۔ انشاء، آتش ناسخ غرض ہر شاعر نے مثنویاں لکھیں لیکن انہیں مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ دبستان لکھنو کے ایک یادگار مثنوی نگار کی حیثیت سے امیر مینائی بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ تاہم غدر کے بعد طویل مثنویوں کو زوال آیا اور نظم کی ترقی کی وجہ سے مثنوی کی صنف پر توجہ کم ہونے لگی۔ اس طرح رفتہ رفتہ مثنوی کی صنف پر زوال آیا۔ حالی کی توجہ دہانی پر ترقی پسند شاعروں نے اس صنف کی ترقی پر توجہ دی۔ ترقی پسند شاعر کی مثنوی سے اقتباس بطور مطالعہ درج ہے۔

Scanned by CamScanner

مثنوی

امن نامہ

از جاں نثار اختر

ترقی پسند شاعروں کی صف میں جاں نثار اختر ایک اہم شاعر کا درجہ رکھتے ہیں۔ و
۸/فبروری ۱۹۱۴ء کو گوالیار (مدھیہ پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد افتخار حسین مضطر خیرآبادی بھی
اچھے شاعر تھے۔ گوالیار میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور وکٹوریہ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان
کامیاب کیا۔ ۱۹۳۷ء میں علی گڑھ سے بی۔اے اور ۱۹۳۹ء میں ایم۔اے کا امتحان کامیاب کیا۔ و
''اُردو ناول کا ارتقاء'' عنوان پر پی۔ایچ۔ڈی کرنا چاہتے تھے جو ممکن نہ ہوسکا۔ ملازمت کا آغاز
وکٹوریہ کالج کے لکچرر کی حیثیت سے کیا۔ ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ میگزین کے مدیر اور انجمن حدیقۃ الشعرا
کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اسی سال مجاز کی بہن صفیہ سے شادی ہوئی۔ جاں نثار نے گوالیار کے بعد
حمیدیہ کالج بھوپال میں لکچررشپ کی اور ۱۹۴۹ء میں ملازمت سے مستعفی ہوگئے۔ اشتراکی خیالات سے
وابستگی اختیار کی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر رہے اور ممبئی سے وابستگی اختیار کی۔ صفیہ کی رحلت
کے بعد ۱۹۵۶ء میں بھوپال کی خدیجہ ہارون سے شادی کی۔ کئی فلموں کے گیت لکھے۔ ۱۹۷۴ء میں
انہیں سوویٹ لینڈ ''نہرو ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ سلاسل، جاوداں، تار گریباں اور خاکِ دل ان کے
شعری مجموعے ہیں۔ ''گھر آنگن'' ان کی رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ وطن سے محبت کے پس
منظر میں اختر نے ''ہندوستاں ہمارا'' دو جلدوں میں پیش کی۔ ۱۸/ اگست ۱۹۷۶ء کو فالج کے حملے سے
اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ ترقی پسند نظم، غزل، رباعی اور قطعات ہی نہیں بلکہ جاں نثار اختر نے ترقی پسند
مثنوی کے ذریعہ شہرت حاصل کی۔ ان کی مثنوی ''امن نامہ'' صنفِ مثنوی کے بارے میں حالی کے
خیالات کی توسیع ہے اور بلاشبہ ''امن نامہ'' کے ذریعہ جاں نثار اختر نے حبِ وطن کے جذبے کو ابھارا
ہے اسی لیے ''امن نامہ'' کا اقتباس بطور مطالعہ پیش ہے۔ ✪✪

Scanned by CamScanner

پلا ساقیا! بادۂ خانہ ساز
کہ ہندوستاں پر رہے ہم کو ناز

محبت ہے خاکِ وطن سے ہمیں
محبت ہے اپنے چمن سے ہمیں

ہمیں اپنی صُبحوں سے، شاموں سے پیار
ہمیں اپنے شہروں کے ناموں سے پیار

ہمیں پیار اپنے ہر اک گاؤں سے
گھنے برگدوں کی گھنی چھاؤں سے

ہمیں پیار اپنی عمارات سے
ہمیں پیار اپنی روایات سے

ہمیں پیار ہے اپنی تمیز سے
ہمیں پیار ہے اپنی ہر چیز سے

اٹھائے جو کوئی نظر کیا مجال
ترے رِند لیں بڑھ کے آنکھیں نکال

سلامت رہیں اپنے دشت و دمن
رہے گنگناتا ہمارا گگن

نگاہیں ہمالہ کی اُونچی رہیں
سدا چاند تاروں کو چھوتی رہیں

رہے پاک گنگو تری کی پھبن
مچلتی رہے زلفِ گنگ و جمن

رہے جگمگاتا یہ سنگم کا رُوپ
چمکتی خنک چاندنی، نرم دھوپ

جھلکتی رہے یہ اشوکا کی لاٹ
یہ گوکُل کی گلیاں، یہ کاشی کے گھاٹ

لٹاتی رہیں اپنے نینوں کا مدھ
یہ صبحِ بنارس، یہ شامِ اودھ

نہاتا رہے نرم کرنوں میں تاج
رہے تا قیامت محبت کی لاج

ایلورا کے بُت رقص کرتے رہیں
حسیں غار تاروں سے بھرتے رہیں

رہیں مسکراتی حسیں وادیاں
رہیں شاد جنگل کی شہ زادیاں

ہری کھیتیاں لہلہاتی رہیں
جواں لڑکیاں گیت گاتی رہیں

Scanned by CamScanner

لہکتا رہے سبز میداں میں دھان
زمینوں پہ بچھتے رہیں آسمان

فضا میں گھٹائیں گرجتی رہیں
جواں چھاگلیں تٹ پہ بجتی رہیں

اڑاتی رہے آنچلوں کو ہوا
ملہاروں کی بوندوں میں گونجے صدا

دہکتی رہے پاک ہولی کی آگ
رہیں کھیلتی ناریاں پی سے پھاگ

سدا گائے رادھا کنھیا کے گن
مچلتی رہے بن میں مرلی کی دھن

رہے یہ دیوالی کی جگمگ بہار
منڈیروں پہ جلتے دیوں کی قطار

فضا روشنی میں نہاتی رہے
ہماری زمیں جگمگاتی رہے

رہے آسماں پر دمکتا ہلال
رہے عید کا مسکراتا جمال

گلے سے گلے لوگ ملتے رہیں
دلوں کے جواں پھول کھلتے رہیں

رہے یہ بسنتوں کے میلے کی دھوم
رہیں شاد یہ گیت گاتے ہجوم

حسینوں کے لہکیں بسنتی لباس
رہے نرم چہروں پہ ہلکی مٹھاس

حسیں راکھیاں، جھل جھلاتی رہیں
جھما جھم ستارے لٹاتی رہیں

رہے اپنے بھائی پہ بہنوں کو ناز
یہ معصوم نرمی، یہ میٹھا گداز

گھروں کا تقدس رہے برقرار
یہ بیٹوں کے ماتھوں پہ ماؤں کا پیار

رہے شاد آباد صحنوں کی دھوم
رہیں آنگنوں میں ''چہکتے نجوم''

سلامت رہے دلھنوں کی پھبن
سلامت رہیں دل میں کھلتے چمن

سلامت رہے انکھڑیوں کی حیا
سلامت رہے گھونگھٹوں کی ادا

سلامت دوپٹوں کی رنگیں بہار
سلامت جواں آنچلوں کا وقار

سلامت رہے پاک افشاں کا نور
سلامت رہے بندیوں کا غرور

سلامت رہے کاجلوں کی لکیر
سلامت رہیں نرم نظروں کے تیر

Scanned by CamScanner

سلامت رہے چوڑیوں کی کھنک
سلامت رہے کنگنوں کی چمک

سلامت حسینوں کے سولہ سنگھار
یہ جوڑے یہ لپٹے چنبیلی کے ہار

سلامت رہیں مرگ نینوں کے بان
سلامت رہے مرنے والوں کی شان

سلامت وفاؤں کے ارماں رہیں
سلامت محبت کے پیماں رہیں

سلامت رہیں ہیر رانجھے کے گیت
رہے ہار میں بھی محبت کی جیت

لجانا رہے، مسکرانا رہے
منانا رہے، روٹھ جانا رہے

محبت کے چشمے اُبلتے رہیں
جواں سال نغموں میں ڈھلتے رہیں

رہے دھوم ٹیگور و اقبالؔ کی
رہے شان پنجاب و بنگال کی

رہے نام اپنے ادب کا بلند
دِلوں میں سمایا رہے پریم چند

سدا زندگانی غزل خواں رہے
زمانے میں غالبؔ کا دیواں رہے

فضاؤں میں چھڑتے رہیں یہ ستار
سدا جھنجھناتے رہیں دل کے تار

مچلتی رہے مست بینا کی مئے
برستی رہے سات رنگوں کی مئے

دہکتا رہے اپنے دیپک کا راگ
کلیجوں میں لگتی رہے نرم آگ

رہے گونجتی گھنگھروؤں کی کھنک
دفوں کی صدا، ڈھولکوں کی گمک

یہ گھومر یہ کتھک کے توڑے رہیں
جواں ناچ دل کو جھنجھوڑے رہیں

رہے ساقیا بادہ خواروں کی خیر
رہے ساقیا! تیرے پیاروں کی خیر

اُبھرتا رہے زندگانی کا جوش!
رہے تیرے رندوں کو دنیا کا ہوش

صراحی سے ساغر رہے متصل
نہ ٹوٹے کبھی تیرے شیشوں کا دل

اُٹھا جام، ہاں دور ساقی رہے
جہاں میں سدا امن باقی رہے

Scanned by CamScanner

قصیدہ

عربی لفظ قصد سے مشتق ہے قصیدہ ایک طویل نظم ہوتی ہے۔ قصد کے معنی ارادہ کرنا کے لئے جاتے ہیں چنانچہ ایسی شاعری جس میں ارادہ کے ساتھ تعریف کی خصوصیت کو اختیار کیا جائے وہ قصیدہ کہلاتی ہے۔ اُردو کی شعری اصناف میں قصیدہ ایک ایسی طرز شاعری ہے جس میں بالارادہ صاحب شخصیت کی تعریف کی جاتی ہے اور اسے مدحیہ قصیدہ کہا جاتا ہے اس کے بجائے مکمل ارادہ کے ساتھ کسی شخصیت کی تذلیل کی جائے تو اسے ہجویہ قصیدہ کہا جاتا ہے۔ یعنی قصیدہ جیسی صنفِ شاعری میں مدح یعنی تعریف اور ہجو یعنی تذلیل دونوں طرح کے انداز اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ قصیدے عام طور پر غزل کے انداز پر لکھے جاتے ہیں لیکن قصیدہ، بلند آہنگ اور طمطراق لہجہ کی وجہ سے اس کا انداز اونچے سروں والا اور پہاڑوں سے آنے والی گونج جیسا ہوجاتا ہے۔ ✪✪

اجزائے ترکیبی

ایک قصیدہ چار حصوں پر مشتمل ہوتا ہے جسے قصیدہ کے اجزائے ترکیبی کہتے ہیں۔

۱۔ مطلع ۲۔ تشبیب ۳۔ گریز ۴۔ دعا

قصیدہ کا پہلا شعر مطلع ہوتا ہے جس میں کسی اہم بات کا تقاضہ کیا جاتا ہے۔ پہلے شعر کے آغاز کے بعد شاعر ماحول سازی کے لیے شاعری میں مطلع کے قوافی و ردیف کے ساتھ موسم، چاند، چاندنی، رات، بہار یا پھر کسی منظر کی تعریف کرتا ہے جسے ''تشبیب'' کہا جاتا ہے۔ جو قصیدہ کا دوسرا حصہ ہے۔ ''تشبیب'' کے بعد چند اشعار کے ذریعے شاعر کسی وجہ یا مقصد کے بیان پر توجہ دیتا ہے جو تشبیب سے مختلف ہوتا ہے

تاریخی جائزہ

اُردو کی ہر صنفِ شاعری کا آغاز دکن سے ہوا۔ دکنی میں لکھے گئے قصیدوں میں اجزائے ترکیبی موجود نہیں تھے۔ دکنی مثنویوں میں پیرو مرشد کی مدح، بزرگانِ دین کی تعریف اور بادشاہِ وقت کی تعریف کی وجہ سے دکنی میں قصیدہ کی روایت کا پتہ چلتا ہے۔ مثنوی میں قصیدہ کی طرح ایک ہی انداز کا قافیہ نہیں ہوتا۔ دکن کے بہمنی، قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں باضابطہ قصیدہ کی روایت کا پتہ چلتا ہے لیکن ان قصیدوں میں اجزائے ترکیبی اور بلند آہنگ کی کمی پائی جاتی ہے۔

مغلیہ دور کے زوال کے بعد دہلی کے دبستان میں قصیدہ کو عروج حاصل ہوا۔ مرزا محمد رفیع سودا کو اُردو قصیدہ کے نقشِ اول کا درجہ حاصل ہے۔ انہوں نے دہلی سے لکھنو ہجرت کر کے اُردو قصیدے کو فارسی کے قصائد کا ہم رتبہ

Scanned by CamScanner

اور ماحول و منظر سے علاحدگی اختیار کی جاتی ہے اسی لیے اسے گریز کا درجہ حاصل ہے۔ گریز میں موسم، بہار اور ماحول کی تعریف سے ہٹ کر بادشاہِ وقت یا امیر کی تعریف کے لیے جواز پیدا کیا جاتا ہے۔ اسی گریز کے دوران شاعر صاحبِ شخصیت کی مبالغہ آمیز تعریف کرتا ہے جو مدح کہلاتی ہے۔ مدح کرتے ہوئے شاعر اپنی خواہش یا طلب کا اظہار بھی کرتا ہے جسے حسنِ مدعا کہا جاتا ہے اور آخر میں شاعر صاحبِ شخصیت کے عمر و اقبال میں ترقی کے لیے دعائیہ کلمات ادا کرتا ہے جسے دعا کہتے ہیں۔ اسی طرح کسی زندہ شخصیت کی تعریف کے لیے مطلع۔ تشبیب، گریز اور دعا کے ذریعہ جو شاعری کی جائے اسے قصیدہ کہتے ہیں۔

ایسے قصیدے تعریف کی نمائندگی کرنے کی وجہ سے مدحیہ قصیدے کہلاتے ہیں اور اگر مدح کے بجائے مذاق اڑانے کا انداز قصیدہ میں شامل ہوجائے تو ایسا قصیدہ اپنے انداز کی وجہ سے ہجویہ قصیدہ کہلاتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے بیانیہ، خطابیہ، نعتیہ اور تمہیدیہ قصیدے لکھے جاتے ہیں جس قافیہ یا ردیف پر قصیدے کے اشعار ختم ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی قصیدے کی پہچان ہوتی ہے جیسے لام قافیہ پر ختم ہونے والا لامیہ اور میم قافیہ پر ختم ہونے والا میمیہ اور نون قافیہ پر ختم ہونے والا قصیدہ نونیہ کہلائے گا۔ اس طرح قصیدہ کی پہچان مدح و ہجو کے ساتھ ساتھ اس کے قافیہ کے اختتامیہ سے بھی ممکن ہے۔

بنا دیا۔ انوری۔ خاقانی اور قاآنی کیطرح سودا نے قصیدے کی آبیاری کی۔ قصیدے میں اجزائے ترکیبی کا تعین بھی سودا کے ذریعے ہوا اور قصیدے کے نقشِ اول ہونے کے باوجود سودا نے قصیدہ کو بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ اُردو قصیدہ دہلی سے لکھنو پہنچا تو لکھنو میں منیر شکوہ آبادی، انشاء اللہ خان انشاء اور محسن کاکوروی جیسے قصیدہ گو پیدا ہوئے اور آخری دور میں امیر مینائی کی قصیدہ گوئی کے بھی خوب چرچے رہے۔ دہلی میں شیخ ابراہیم ذوق، مومن خان مومن، مرزا غالب اور داغ دہلوی نے اس صنفِ شاعری کی خوب خدمت کی۔ اس طرح دکن کے بعد دہلی اور لکھنو میں قصیدہ کو عروج حاصل ہوا۔

بادشاہت، جاگیردارانہ نظام اور شاہ پرستی کے خاتمے کے ساتھ ہی قصیدہ کی صنف کو زوال آیا۔ قصیدہ میں چونکہ مدح اور مبالغہ اختیار کیا جاتا ہے چنانچہ امیر و امراء، بادشاہ اور صاحبِ اقتدار افراد کی موجودگی میں مدح کی ستائش ہوتی تھی۔ جب اقتدار ختم ہوا۔ بادشاہ اور امیر زادے نہ رہے تو اس صنف کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی۔ تاہم قدیم دور سے ہی مدح کی ایک ایسی روایت کا سلسلہ آج بھی جاری ہے جسے ''سہرا'' کہا جاتا ہے۔ قصیدہ زوال پذیر ہوا لیکن ''سہرا'' لکھنے کی روایت عام ہے۔ جس طرح قصیدہ کے دوران ہجو کا امکان ہے اور سودا نے کامیاب ہجویہ قصیدہ ''تضحیک روزگار'' لکھا۔ اسی طرح دولہا، دولہن اور ان کے افرادِ خاندان کو ہجو میں مزاحیہ سہرے بھی لکھے جاتے ہیں۔ غرض قصیدہ کی روایت ختم ہوئی لیکن اُردو میں مدح کو جاری رکھتے ہوئے شاعری میں ''سہرا'' کا چلن عام ہے جو قصیدہ نہیں لیکن مدح کی نمائندگی کرتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مبالغہ آمیز تعریف اور حوصلہ شکن تذلیل کی روایت کو قصیدہ کے زوال کے ساتھ کوئی نسبت حاصل نہیں ہوئی جو سب کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔

Scanned by CamScanner

در شانِ حمید الدّولہ

از شیخ ابراہیم ذوقؔ

شیخ ابراہیم ذوقؔ (۱۷۸۹ء......۱۸۵۴ء) شاہ نصیر کے شاگرد اور بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد تھے۔ قصیدہ گوئی کی بنا پر اکبر شاہ ثانی نے انہیں خاقانیِ ہند کا خطاب دیا تھا۔ کم و بیش پچاس سال شاعری کی۔ ذوقؔ نے یوں تو غزل اور دیگر اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی اور اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا لیکن ان کی حقیقی شہرت ان کے قصیدوں کی رہینِ منت ہے۔ محاورہ بندی، شوکتِ الفاظ، روانی و شگفتگی اور علوئے مضامین و معنی آفرینی ذوقؔ کے قصیدوں کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

ذیل کا قصیدہ جو عید کے موقع کے لیے لکھا گیا ہے، حمید الدولہ کی مدح میں ہے۔ موصوف ان کے سرپرست تھے۔ شاعر اس قصیدے میں بڑی خوب صورتی سے اپنے مدعا کا اظہار کرتا ہے جسے قصیدے کی اِصطلاح میں حسنِ طلب کہتے ہیں۔ ✪✪

آج ہے وہ روزِ عشرت، آج وہ دن عید کا
ہوتے ہیں آکر بغل گیر، آشنا سے آشنا

عید ہے، گھر دوستوں کے جاتے ہیں ملنے کو دوست
ہے یہی رسمِ محبت، ہے یہی راہِ وفا

ہاں، چنانچہ ایک میرے بھی شفیق و مہرباں
یارِ جانی، دوستِ صادق اور محبّ با صفا

آئے میرے گھر وہ اور احوال میرا دیکھ کر
دیر تک حیراں رہے اور بعدِ حیرت یہ کہا

”ذوقؔ تُو تو اب تلک وہی پریشان حال ہے
وہی اک کہنہ دو شالہ، وہی اک کہنہ قبا

آشنا تیرے ہزاروں اور لاکھوں تیرے دوست
جو ملے گا تجھ کو یہ پوچھے گا تجھ سے برملا

کیا ہوا انعام تجھ کو، تو نے کیا پایا صِلا
کیا ہوئی تنخواہ تیری، کیا ترا منصب بڑھا

ہم نے مانا تو ہے اک درویش خو، قانع مزاج
جو میسّر آیا کھایا اور کیا شکرِ خدا

جلد کر نواب سے احوال اپنا جا کے عرض
اور یہ جو کچھ حقیقت ہے، یہ سب اُس کو سُنا“

Scanned by CamScanner

جب سُنے اس آشنا کے مُنھ سے میں نے یہ کلام　　　دوہیں خدمت میں تری یہ کہہ کے میں حاضِر ہوا

مطلعِ ثانی

بحر و بر میں جھاڑ دے دامن اگر تو فیض کا　　　قطرہ، دُرِّ بے بہا ہو، لعل، سنگِ بے بہا

تو وہ دانا، تیری دانائی کی دانائے فرنگ　　　داد دیتے ہیں کہ ہاں، اے آفریں، اے مرحبا

ہوشیاری کا جہاں لشکر ہے، سرِ لشکر ہے تو　　　خیر خواہی کا جہاں رستہ ہے، تو ہے رہ نما

دوست دارِ ملک و دولت خواہِ شاہِ دیں پناہ　　　ہوشیار و مردِ آخر بیں، امیر و پارسا

دیکھتے ہیں ہم وہی بے ساختہ تیرا عمل　　　علم سے جو عالموں نے ہے کتابوں میں لکھا

کیا لکھوں تعریف تیری، میری قاصر ہے زباں　　　لیک تیرے حق میں ہے یہ دم بہ دم دل سے دُعا

عید، ہو تجھ کو مبارک اور دولت ہو فزوں

اور بدولت تیری، میرا بھی بر آئے مُدعا

Scanned by CamScanner

مرثیہ

عربی لفظ "رثی" سے مشتق لفظ مرثیہ شاعری کی ایک موضوعاتی صنف ہے۔ رثی کے معنی مرنے والے پر رونے یا بین و بُکا کرنے کے ہیں۔ ایسی شاعری جس میں کسی کے مرنے پر افسوس کیا جائے اور مرنے والے کے محاسن بیان کیے جائیں تو اسے مرثیہ کہتے ہیں۔ اُردو زبان میں طویل عرصہ تک حضرت امامِ حسین کی شہادت اور واقعاتِ کربلا بیان کر کے مرثیے لکھے گئے۔ مرثیہ ایسی شاعری کو کہا جاتا ہے جس میں مرنے والے پر افسردگی ظاہر کرتے ہوئے اس کی اچھائیاں بیان کی جائیں۔ غرض مرثیہ کی شاعری مرحوم لوگوں پر شاعر کے جذبات اور احساسات کی نمائندگی کرتی ہے۔ ✪✪

مرثیہ کے اجزائے ترکیبی

اُردو میں ابتداء جو مرثیے لکھے گئے ان کے لیے نہ تو کوئی ہیئت مقرر تھی اور نہ ہی ان کے لیے اجزائے ترکیبی موجود تھے بلکہ شاعر غزل اور مثنوی کے انداز میں کربلا کے واقعات بیان کرنے پر اکتفا کرتا تھا۔ قلی قطب شاہ اور وجہی کی رثائیہ غزلیں اور اشرف کی مثنوی "نوسرہار" دکنی مرثیہ کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ جس کے بعد دکن میں "شہادت نامہ" کی روایت کا آغاز ہوا۔ جب مرثیہ دہلی پہنچا تو سب سے پہلے سودا نے مرثیہ کے لیے مسدس کی ہیئت کو ضروری سمجھا اور لکھنو میں اس کے اجزائے ترکیبی مدون کیے گئے۔ جن کے مطابق اُردو مرثیہ آٹھ اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔

۱۔ چہرہ ۲۔ سراپا ۳۔ رخصتی ۴۔ رجز ۵۔ جنگ ۶۔ شہادت ۷۔ بین وبکا ۸۔ دُعا

تاریخی جائزہ

دوسری شعری اصناف کی طرح مرثیہ کی روایت بھی دکن سے شروع ہوتی ہے۔ دکنی شاعروں نے رثائی کلام اور واقعات کربلا بیان کرنے کے دوران امام حسینؓ کی شہادت کے اظہار پر زور دیا اور فن پر توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ دکن میں اُردو مرثیے، غزل اور مثنوی کے انداز میں لکھے جاتے رہے۔ دکن کی شیعہ سلطنتوں کی وجہ سے جنوبی ہند میں مراسمِ محرم کا سلسلہ شروع ہوا اور ماہ محرم میں مجالس پڑھنے کی غرض سے کربلا کے واقعات پر مبنی "شہادت نامے" لکھے جانے لگے۔ فضل علی فضل کی "کربل کتھا" کو اُردو کے پہلے شہادت نامہ کا درجہ حاصل ہے۔ اسی طرح "روضۃ الشہداء" کو بھی دکن کے اہم شہادت ناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جب مرثیہ کی روایت شمالی ہند پہنچی تو بیشتر شعراء نے غزل کے انداز میں مرثیے لکھے۔ دلی کے ابتدائی اُردو شعراء نے بھی مرثیہ کی ہیئت اور اجزائے ترکیبی پر توجہ نہیں دی۔ دلی کے مغل

مرثیہ لکھنے کے دوراں سب سے پہلے میدانِ جنگ کا حال بیان کرنا چہرہ کہلاتا ہے جس کے بعد جنگ کے میدان میں آنے والے شخص، اس کے گھوڑے اور تلوار کا سرتاپا جائزہ سراپا کہلاتا ہے۔ اس مرحلہ کے بعد جنگ پر جانے والے فرد کا اپنے خاندان سے مل کر جنگ پر جانے کی اجازت طلب کرنا رخصتی کہلاتا ہے۔ میدانِ جنگ میں دو بدو ہوکر ایک دوسرے کے خاندانی اور ذاتی کارنامے بیان کرنے کا عمل رجز کہلاتا ہے۔ رجز کے دوران طیش میں آکر ایک دوسرے پر حملہ جنگ کہلاتی ہے جنگ کے بعد حق پرست کی موت شہادت کا درجہ رکھتی ہے جس کی اطلاع خاندان والوں میں پہنچنے کے بعد ان کے رونے اور افسردگی کے اظہار کو بین و بکا کہا جاتا ہے اور مرثیہ کے اختتام پر شاعر شہادت دینے والوں کی قربانی قبول کر کے امت کو بخش دینے کی خدا سے دعا کرتا ہے اس طرح ایک مرثیہ آٹھ اجزا پر مشتمل ہوتا ہے۔ دورِ حاضر میں کربلائی مرثیہ کا رواج کم ہوگیا ہے۔ شخصی مرثیے اور وفاقیہ شاعری میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ اُردو کے بیشتر شعرا نے پابند نظم، آزاد نظم اور معری نظم کے علاوہ ہر قسم کی ہیئت میں شخصی مرثیے لکھے۔ کچھ کربلائی مرثیے لکھے گئے تو اس کی مسدس کی ہیئت کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ اس طرح اُردو شاعری میں کربلائی مرثیہ کے علاوہ شخصی مرثیے اور وفاتے لکھنے کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے۔

تاجداروں کی کمزوری کے بعد لکھنو میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد پڑی جس نے شیعہ مسلک کو اختیار کیا اور ماہ محرم میں کربلا کے واقعات کے بیان پر توجہ دی جس کی وجہ سے لکھنو میں مرثیہ نگاری کو ارتقاء حاصل ہوا۔ مسدس کی ہیئت میں میر مستحسن خلیق، میر ببر علی انیس، مرزا دبیر جیسے شعراء نے لکھنوی مرثیہ میں نہ صرف ڈرامائی عناصر کو شامل کیا بلکہ ہندوستانی رسم و رواج کے اثر کو بھی مرثیہ میں شامل کیا۔ لکھنوی مرثیہ میں مبالغہ اور سیرتِ حسین کے بیان میں اختیار کردہ روش کی وجہ سے شاعرانہ حسن کے تمام گوشے نمایاں ہوگئے لیکن اُردو مرثیہ کے مطالعہ سے تاریخ کربلا مرتب نہیں کی جاسکتی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ لکھنوی شعراء نے اُردو مرثیہ کو زبان و بیان کے عمدہ محاسن سے اس قدر مالامال کردیا کہ مرثیہ کو اُردو شاعری اور ادب کے موثر اظہار کا درجہ حاصل ہوگیا۔ مرثیہ میں مبالغہ، ڈرامائی عناصر اور ہندوستانی عناصر کے شامل ہوجانے کی وجہ سے اس صنف میں شاعری کی احسن روایات کا آغاز تو ہوا لیکن اس شاعری سے تاریخی اور حقیقی واقعات کا ربط ٹوٹتا چلا گیا جس کی وجہ سے مرثیہ میں بہترین احسانات، جذبات کے مکالمہ جات کا اظہار تو دکھائی دیتا ہے اور اس اظہار میں تاثیر اور شدت کی اس قدر کثرت ہے کہ شاعری اظہار کا موقع بن جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ "اُردو مرثیہ" میں صنفِ شاعری کے رزمیہ عناصر Epic Poetry کا دخل ہوتا ہے۔ اُردو مرثیہ دوسری زبانوں کے رثائی ادب Elegy سے بالکل مختلف ایک مؤثر اظہار کی شعری صنف کا درجہ حاصل کرتی جارہی ہے۔ آج بھی واقعاتِ کربلا سے وابستہ مرثیے، سلام، نوحے اور رثائی خیالات پیش کر کے اُردو شاعری کے جواہر کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

Scanned by CamScanner

مرثیہ

گرمی کا سماں

از میر انیسؔ

میر ببر علی انیسؔ (۱۸۰۱ء......۱۸۷۴ء) فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ میر خلیقؔ کے بیٹے اور میر حسن کے پوتے تھے۔ شاعری میں اپنے والد کے شاگرد تھے۔ انیسؔ اُردو کے سب سے بڑے مرثیہ نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے آلِ رسولؐ کی مدّاحی میں جو ناموری حاصل کی یہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ انیسؔ سے پہلے اُردو مرثیوں میں جذبۂ غم والم کو اُبھارنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ میر ضمیرؔ اُردو مرثیے میں مناظرِ قدرت، سراپا نگاری اور واقعاتِ جنگ کا بیان شامل کر کے اس کا دامن وسیع کر چکے تھے۔ انیسؔ نے ان روایات کو ترقی دے کر منتہائے عروج کو پہنچایا اور مرثیے کو رزمیے کا درجہ عطا کیا۔ انہوں نے نہ صرف انسانی جذبات واحساسات کے نازک ترین پہلوؤں کی موثر ترجمانی کی بلکہ کردار نگاری کے بھی کامیاب نمونے پیش کیے۔ ان کے مرثیے زبان وبیان پر ان کی غیر معمولی قدرت کے مظہر ہیں۔

اقتباسِ ذیل میں انہوں نے میدانِ کربلا میں روزِ جنگ کی گرمی کی شدت کا نقشہ کھینچا ہے۔ گو بیان مبالغہ آمیز ہے لیکن گرمی کی شدت کے اظہار کے لیے یہی پیرایۂ اظہار مناسب تھا۔ انیسؔ نے موضوع کی رعایت سے ایک یک لفظ بڑی احتیاط کے ساتھ منتخب کیا ہے اور انہیں بڑی مہارت سے مصرعوں میں جگہ دی ہے۔ ✪✪

گرمی کا روزِ جنگ کی کیوں کر کروں بیان
ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زبان
وہ لو، کہ الحذر، وہ حرارت کہ الاماں
رن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسمان
آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

آب رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھی سات پردوں کے اندر عَرق میں تر
خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر

Scanned by CamScanner

گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

شیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے   آہو نہ منھ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے   گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلہ جوّالہ کا گماں   انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
مُنہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں   تہ میں تھے سب نہنگ، مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ، گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

آئینہ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب   چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب   کافورِ صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ، گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

Scanned by CamScanner

رباعی

رباعی کا لفظ عربی زبان سے مشتق ہے۔ ربع کے معنی عربی زبان میں چار کے لیے جاتے ہیں۔ ایسی شاعری جس میں کوئی خیال یا سوچ کو صرف چار مصرعوں میں پیش کیا جائے اور آخری مصرعہ دنیا کی اٹل حقیقت کی نشاندہی کرے تو ایسے چار مصرعوں والی شاعری کو رباعی کہا جاتا ہے۔ عربی سے فارسی اور فارسی سے اُردو میں رائج ہونے والی شعری صنف رباعی کا وزن لاحول ولاقوۃ الا باللہ سے ماخوذ ہے۔ اُردو شاعری میں ابتداء سے ہی رباعی کی روایت عام رہی۔ رباعی کے لیے عروضی وزن مخصوص ہے۔ بحر ہزج کے چوبیس مخصوص اوزان میں رباعی لکھی جاتی ہے۔ ✪✪

رباعی کی صنف اور اقسام

شاعری کی بحر ہزج کے چوبیس اوزان رباعی جیسی شاعری کے لیے مخصوص ہیں۔ مفاعیلن کے چار بار استعمال سے بحر ہزج کی تشکیل ہوتی ہے۔ فارسی میں رباعی کو ترانہ بھی کہا جاتا ہے۔ رباعی لکھنے کے دوران پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعہ میں قافیہ ردیف کا اہتمام ہوتا ہے جبکہ تیسرا مصرعہ قافیہ وردیف سے خالی ہوتا ہے رباعی کے چوتھے مصرعہ میں قافیہ اور ردیف کی تکمیل کے ساتھ کوئی ٹھوس حقیقت کا اظہار بھی لازمی ہے۔ بعض رباعی گو شعراء نے پہلے مصرعہ میں قافیہ اور ردیف کے استعمال کو ضروری نہیں سمجھا۔ بہر حال رباعی ایک ایسی صنف ہے جس سے چار مصرعوں میں کیفیاتی فضا تیار کی جاتی ہے۔

ا۔ متصوفانہ یا عارفانہ رباعی:۔ اُردو کے شاعروں

تاریخی جائزہ

اُردو شاعری میں محمد قلی قطب شاہ (وفات ۱۶۱۲ء) کے دور سے ہی رباعی کا رجحان موجود ہے۔ فارسی زبان سے استفادہ کے نتیجہ میں سب سے پہلے قطب شاہی دور کے شاعروں نے علاقہ گولکنڈہ کے توسط سے رباعی کی روایت کو فروغ دیا۔ پروفیسر سیدہ جعفر کی کتاب "دکنی رباعیوں" کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قطب شاہی دور کے بیشتر شعراء نے رباعی کی جانب توجہ دی جن میں ملا وجہی، غواصی، ابنِ نشاطی اور فائز اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی طرح جب بیجاپور میں عادل شاہی سلطنت قائم ہوئی تو اس مملکت کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ اور علی عادل شاہ شاہی نے بھی شاعری کی اور ان کے دور میں عبدل، نصرتی، دولت، صنعتی، شاہ ملک، طبعی، سیوا، اور امین جیسے شعراء نے ذائقہ بدلنے کے لیے رباعی گوئی کی طرف توجہ دی۔ دکن میں جب مغلیہ دور شروع ہوا تو ولی، سراج، لچھمی نرائن شفیق، عبدالولی عزلت، اسد علی خان تمنا، شیر محمد خاں ایماں اور دوسرے شعراء نے اورنگ آباد کے توسط سے رباعی جیسی

نے صوفیانہ خیالات اور ظاہر و باطن کے اظہار کے ذریعہ متصوفانہ رباعیات کی بنیاد رکھی اس قسم کی رباعیات میں خدا اور بندے کا تعلق، تزکیۂ نفس، شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کے بھید کھولے جاتے ہیں۔

۲۔عشقیہ رباعی:۔ دنیا کے فانی عشق اور مرد و عورت کے حسن کے علاوہ ان کے راز و نیاز کو رباعی کی شکل میں پیش کیا جائے تو ایسی رباعی عشقیہ رباعی کے زمرے میں شامل کی جائے گی۔

۳۔ اخلاقی رباعی:۔ تہذیب و اخلاق اور اچھے اقدار کی نمائندگی رباعی کے انداز میں کی جائے تو ایسی رباعی میں چونکہ نصیحت، اخلاق سدھار اور انسانوں کی زندگی میں تبدیلی لانے کا رجحان موجود ہوتا ہے اس لیے ایسی رباعی کو اخلاقی رباعی کہا جاتا ہے۔

۴۔ مسائلی رباعی:۔ انسانی زندگی کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو رباعی میں بیان کیا جائے تو ایسی رباعی مسائلی رباعی کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

۵۔ وارفتہ رباعی:۔ سنسکرت کے زیر اثر ''سنگار رس'' کو رباعی میں شامل کر کے فراق نے اس صنف کو عارفانہ اور اخلاقی رویہ کے بجائے جنس اور فراق سے وابستہ کیا۔ اس قسم کی رباعیوں میں عورت اپنے شوہر پر اور مرد اپنی نصف بہتر پر فخر کرتا اور ہر دو ایک دوسرے کو زندگی کا لازمہ تصور کرتے ہیں۔ یہ انداز اُردو رباعی میں فراق ہی نہیں بلکہ جاں نثار اختر کی رباعیات میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

صنفِ شاعر میں طبع آزمائی کی۔ ۱۷۰۰ء میں ولی کے دلی پہنچنے کے بعد دلی کی فارسی شاعری پر اُردو شاعری کا غلبہ ہو گیا۔ مضمون، یکرنگ، ناجی اور فائز نے غزل کے ساتھ ساتھ رباعی کی صنف میں طبع آزمائی کی۔ میر و سودا کے عہد میں بھی رباعی کی صنف جاری رہی لیکن غالب کے عہد میں مولانا حالی نے رباعی کے ذریعہ صوفیانہ اور اخلاقی خیالات کی پیشکشی کی طرف توجہ دی۔ دبستانِ دہلی کے بعد لکھنو کے شاعروں نے اخلاقی اور پند و نصائح کے دفتر بیان کرنے کے لیے رباعی کا استعمال کیا۔ میر انیس اس میدان میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ لکھنو کے ہر شاعر کے کلام میں رباعی کی صنف شامل ہے اور جد و جہد آزادی کے دوران دہلی اور لکھنو کے شعراء نے حسنِ اخلاق اور تہذیب و شائستگی کے بیان کے لیے رباعی کی صنف پر توجہ دی۔ اکبر الہ آبادی، جگت موہن لال رواں، مولانا حالی اور دوسرے شعراء اس دور کے نامور رباعی گو شعراء میں شامل کیے جاتے ہیں بیسویں صدی کے اوائل کے ساتھ ہی رباعی کی صنف کو نئے انداز سے وابستہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ فراق گورکھپوری نے رباعیوں کے مجموعہ ''روپ'' میں سنسکرت کے سنگار رس کو شامل کیا۔ ریاض خیر آبادی، فانی، جلال اور امیر مینائی کی رباعیوں میں روایتی عناصر کارفرما ہیں۔ عزیز لکھنوی، جوش، جمیل مظہری اور اختر شیرانی نے رباعی میں رومانی انداز کو روا رکھا جبکہ امجد حیدرآبادی اور شاد عارفی نے اپنی رباعیوں کے ذریعہ رباعی کی صنف میں نکھار پیدا کیا۔ امجد کو رباعی گوئی کی وجہ سے اُردو کے ''سرمدِ ثانی'' کا خطاب دیا گیا ہے۔ دور حاضر میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو بنیاد بنا کر رباعیات لکھی جارہی ہیں۔ موجودہ دور میں راشد آزر اور اصغر ویلوی نے رباعی کی صنف کو پوری شدت سے استعمال کیا ہے اور ملک گیر سطح پر اس صنف کے استعمال میں جدید تقاضوں کی تکمیل کی جا

Scanned by CamScanner

تعارف

۱۔ میر ببر علی انیس

اُردو شاعری میں مرثیہ نگاری کے امام قرار دیئے جاتے ہیں۔ ۱۸۰۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے اور ۱۸۷۱ء میں لکھنو میں انتقال کیا۔ مناظرِ قدرت اور مناظر جنگ کو پیش کرنے میں بڑا کمال رکھتے تھے۔ اُردو مرثیہ میں ڈرامائی عناصر کو شامل کر کے شہرت حاصل کی۔ کربلا کے واقعات کا تعلق حسنِ اخلاق، مرّوت، ہمدردی اور صبر و قناعت سے ہے۔ ان معاملات کو شاعری میں بیان کرتے ہوئے انیس نے محسوس کیا کہ ایسی اخلاقی، عارفانہ، روحانی اور رمزیہ باتوں کو پیش کرنے کے لیے مرثیہ کے علاوہ دوسرا اندازِ شاعری استعمال کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے ''رباعی'' گوئی کی طرف توجہ کی اور بہترین رباعیات لکھ کر اُردو رباعی گوئی کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔ میر انیس کی رباعیوں میں دنیا کی بے ثباتی، تہذیب سے وابستگی اور اخلاق کے پاس و لحاظ کا رویہ موجود ہے۔ مشرقی آداب و مراتب اور مذہب و اخلاق کی شائستگی کو وہ اپنی رباعیوں میں شامل کر کے انسان کو بندہ پروری کرنے اور بندگی اختیار کرنے کا درس دیتے ہیں۔ مذہب کی پابندی اور اخلاقی سدھار رویہ میر انیس کی رباعیوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔ ✪✪

۲۔ خواجہ الطاف حسین حالؔی

اُردو نظم، غزل، شاعری اور نثر نگاری میں امتیازی مقام رکھنے والے غالبؔ کے شاگرد اور سرسید کے رفیق خواجہ الطاف حسین حالؔی ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ نثر میں سوانح نگار اور تنقید نگاری کی حیثیت سے اور شاعری میں مثنوی، قصیدہ، نظم اور غزل گو شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ اُردو شاعری میں رباعی کی صنف کو وقار عطا کرنے میں مولانا حالؔی کی خدمات نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ نیچرل شاعری کے موجد اور ''مدوجزرِ اسلام'' کے خالق مولانا حالؔی نے رباعی گوئی کے ذریعہ روایاتی مذہبی اور اخلاقی اقدار اور تہذیب و شائستگی کی طرف توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رباعیات میں دنیا اور عزت و جاہ سے محبت نہ کرنے اور انسانیت کی قدر کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ایشیائی ممالک کی قدر شناسی ان کی شاعری کا حصہ ہے اور انہوں نے اپنے دور کے حالات سے متاثر ہونے کے باوجود رباعی جیسی سنگلاخ شاعری کو بلند خیالات اور اعلیٰ معیارات سے گرنے نہیں دیا۔ ان کی رباعی گوئی مثال کا درجہ رکھتی ہے۔ مولانا حالؔی نے بمقام پانی پت ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔ ✪✪

Scanned by CamScanner

۳۔ جگت موہن لال رواں

بابو جگت موہن لال رواںؔ ۱۸۸۹ء میں بمقام لکھنو پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۹۳۴ء میں وا۔ رواںؔ کو صرف رباعی گوئی کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔ ان رباعیوں میں ندرت، تازگی، سلاست ور روانی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری اور رباعیات کا مجموعہ ''روحِ رواں'' کے نام سے مشہور ہے۔ لکھنوی ماحول میں پرورش پائی اور اسی ادبی ماحول میں پرداخت ہوئی۔ رواںؔ نے اُردو رباعی کو سادہ اور ام انداز سے وابستہ کیا۔ پند و نصائح اور واعظانہ خیالات کے ساتھ ساتھ ناصحانہ رویہ کی وجہ سے اُردو باعی میں یکسانیت پیدا ہونے لگی تھی۔ جگت موہن لال رواںؔ کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے روزمرہ ندگی میں اخلاقی اقدار کا پاس ولحاظ رکھنے کی طرف توجہ دی۔ دنیا سے محبت اور دنیاوی کاموں سے رغبت کے خلاف ان کی رباعیاں تاثیر سے بھرپور ہیں۔ جگت موہن لال رواںؔ نے رباعیات کو اخلاق کا پابند رکھا۔ واعظانہ اور ناصحانہ انداز اُن کی رباعی میں دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ انسان کو برے کاموں سے روکنے اور اچھے کاموں کی جانب راغب کرنے کے لیے انہوں نے رباعی کی صنف کو ایک وسیلہ کے طور پر استعمال کیا۔ صرف رباعی کی وجہ سے شہرت رکھنے والے وہ اُردو کے منفرد شاعر ہیں۔ ✪✪

۴۔ سید احمد حسین امجدؔ حیدرآبادی

اُردو رباعی کے شہنشاہ سید احمد حسین امجد حیدرآبادی ۱۸۸۵ء میں بمقام حیدرآباد پیدا ہوئے۔ ان کے والد صوفی سید رحیم علی نے جامعہ نظامیہ میں ان کی تعلیم کا انتظام کیا۔ چھ سال تک تحصیل علم کے بعد بنگلور سٹی ہائی اسکول میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۰۳ء میں پہلی شادی ہوئی۔ ۱۹۰۵ء کی طغیانی میں ان کی اہلیہ اور صاحبزادی بہہ گئیں۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ حمد و نعت اور مناجات کے علاوہ غزلیں اور نظمیں لکھیں لیکن انہیں رباعی گوئی میں شہرت حاصل ہوئی۔ ادارۂ ادبیات اُردو نے امجد کی ڈائمنڈ جوبلی منائی اور ساہتیہ اکاڈمی آندھرا پردیش نے اعتراف خدمات میں ایوارڈ پیش کیا۔ ۲۹/مارچ ۱۹۶۱ء کی شب انتقال ہوا اور درگاہ احاطہ شاہ خاموش ناملی میں مدفون ہوئے۔ امجد حیدرآبادی نے صوفیانہ اور اخلاقی خیالات کو اپنی رباعیوں میں پیش کیا۔ مذہب کا پاس ولحاظ اور اقدار کی پاسداری ان کی رباعیات میں شامل ہے۔ اخلاقی نکات اور قرآنی آیات کی تفہیم ان کی رباعی گوئی کا حصہ ہے۔ ''جمال امجد'' خودنوشت اور ''حکایات امجد'' مضامین کا مجموعہ ہے۔ قناعت، خودداری، انسان دوستی، راست گفتاری اور صداقت پسندی ان کی رباعیوں میں نمایاں ہے۔ ✪✪

Scanned by CamScanner

رباعیات

انیس میر ببر علی

۱۔ پرساں کوئی کب جوہرِ ذاتی کا ہے
ہر گل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا
رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

✪✪✪

۲۔ دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

✪✪✪

حالی۔ خواجہ الطاف حسین

۱۔ دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی بڑا کام
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

✪✪✪✪

۲۔ یارو نہیں وقت آرام کا یہ
موقع ہے آخیر فکرِ انجام کا یہ
بس جب وطن کا جب چکے نام بہت
اب کام کرو کہ وقت ہے کام کا یہ

✪✪✪

Scanned by CamScanner

رواںؔ۔ جگت موہن لال

۱۔ افلاس اچھا، نہ فکرِ دولت اچھی
جو دل کو پسند ہو وہ حالت اچھی
جس سے اصلاحِ نفس ناممکن ہو
اس عیش سے ہر طرح مصیبت اچھی

✪✪✪

۲۔ آزاد ضمیر ہوا، فقیری یہ ہے
دل بے پرواہ رہے امیری یہ ہے
زنجیر نفس ہے باعثِ قید، رواںؔ
محدود ہے خیالؔ اسیری یہ ہے

✪✪✪

امجدؔ۔ احمد حسین

۱۔ کوشش ہے اپنی تمام ستائش کے لیے
کیا کیا کرتے ہیں ایک خواہش کے لیے
ہر ایک نمود پر مٹا جاتا ہے
پُتلے مٹی کے ہیں نمائش کے لیے

✪✪✪✪

۲۔ کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے
مانندِ حباب اُبھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات پہ فخر خسیس
تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

✪✪✪

Scanned by CamScanner

قطعہ

عربی لفظ قطعہ بمعنی ٹکڑے یا کاٹے ہوئے کے ہیں۔ عربی سے فارسی اور فارسی سے اُردو میں یہ صنف شروع ہوئی۔ نظم نگاری میں قطعہ ایک شعری ہئیت ہے۔ قصیدے یا غزل کے دوران مربوط خیال کو مختلف اشعار میں پیش کرنا قطعہ کہلاتا ہے۔ قطعہ کے اشعار غزل یا قصیدے کے دوران معنوی اکائی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ نظم کی ایک ایسی صنف جس میں ایک خیال، جذبہ یا کیفیت کو اشعار میں اس طرح بیان کیا جائے کہ جس کی وجہ سے شعر کا دوسرا مصرع غزل کی طرح ہم قافیہ ہو جائے وہی قطعہ کہلاتا ہے اس کے اشعار کی تعداد کم سے کم دو ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ کی قید نہیں ہے۔ ابتداء میں قطعہ، غزل ہی کا ایک حصہ ہوتا تھا لیکن بعد میں شعراء اسے الگ سے بھی کہنے لگے۔ غزل کی طرح قطعہ میں مطلع کی قید نہیں ہوتی، آج کل دو شعری قطعات کہنے کا چلن عام ہے۔ ✪✪

قطعہ بہ حیثیت صنفِ شاعری

قطعہ میں کم سے کم دو اشعار اور نسیم البلاغت کے مصنف کے مطابق زیادہ سے زیادہ سترہ شعر ہو سکتے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں قطعہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جو ظاہری طور پر غزل یا قصیدہ کا کٹا ہوا حصہ معلوم ہو۔ اسی مناسبت سے اسے قطعہ کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق قصیدہ کو ہیئت اور معنی کے اعتبار سے قصیدہ یا غزل مسلسل خیال کرنا چاہئے۔ فرق صرف یہ کہ قصیدہ اور غزل میں مطلع کا ہونا ضروری ہے اور قطعہ میں عموماً مطلع نہیں ہوتا۔ گویا کسی نظم کے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں قافیہ نہ لانے کے سبب اُسے قطعہ کہا جاتا ہے۔

تاریخی پس منظر

اُردو شاعری میں قطعہ نگاری کی روایت حد درجہ قدیم ہے۔ ۱۳۴۷ء میں دکن میں قائم بہمنی سلطنت کے شعراء جیسے حضرت بندہ نوازؒ، فخر دین نظامی اور قطب دین فیروزؔ کی شاعری میں قطعات موجود ہیں۔ جب بہمنی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا تو دکن میں نئی قائم شدہ پانچ مسلم سلطنتوں میں سے گولکنڈہ کی قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت سے وابستہ شاعروں نے زائد از (۱۶۰) سال تک دکنی شاعری کا چراغ جلائے رکھا۔ قطب شاہی دور کے ملک الشعراء ملا وجہی اور غواصی ہی نہیں بلکہ عادل شاہی دور کے ملک الشعراء نصرتی کی دستیاب غزلوں میں قطعہ کا انداز نمایاں ہے قطب شاہی بادشاہ سلطان محمد قلی، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کی غزلوں میں بھی قطعات دستیاب ہیں۔ عادل شاہی بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نے "نورس"، لکھی اور علی عادل شاہ کے

Scanned by CamScanner

قطعہ میں نہ تو مطلع کی پابندی ہوتی ہے اور نہ ہی ممانعت بلکہ شاعر کو قطعہ لکھنے کے دوران اختیار حاصل ہے کہ وہ جو چاہے طریقہ اپناتے ہوئے اس صنفِ شاعری میں اظہارِ خیال کرے۔ اختر انصاری نے قطعہ کو ایک کٹی ہوئی مختصر نظم کی حیثیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قطعہ میں کسی ایک خیال کو مربوط انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے قطعہ کے اشعار معنوی اعتبار سے ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔

قطعہ کے لیے موضوعات محدود اور متعین نہیں۔ کسی بھی موضوع پر قطعہ لکھا جاسکتا ہے۔ قطعہ کے اشعار کے لیے رباعی کی طرح کسی وزن یا بحر کی تخصیص نہیں لیکن اتنی پابندی ضروری ہے کہ قطعہ کی بحر رباعی کی مخصوص بحروں اور مخصوص اوزان سے مختلف ہو۔ ایسے قطعات جن کا پہلا شعر مطلع کی حیثیت رکھتا ہے ان قطعات اور رباعیات کے درمیان فرق صرف اور صرف مختلف اوزان کے سبب سے ہی ممکن ہے۔ عہد قدیم سے لیکر عصرِ جدید تک تقریباً ہر شاعر کے کلیات اور دواوین میں قطعات کا داخلہ موجود ہے۔ اُردو میں پہلے شعر کو مطلع کی حیثیت دے کر قطعات والے شعراء کی تعداد کم ہے اور اُردو کے بیشتر شعراء کے کلام میں موجود قطعات ایسے ہیں جن کے پہلے شعر کے دونوں مصرعہ مطلع کی حیثیت نہیں رکھتے اور بلاشبہ انہیں حقیقتاً قطعات کہا جائے گا۔

''کلیات'' مرتب ہو چکے تھے۔ اس کی غزلیات اور قصائد سے بھی قطعات کا ذخیرہ دستیاب ہے۔ قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے بیشتر شعراء نے قطعہ نویسی کی طرف توجہ دی اورنگ زیب کے اورنگ آباد میں پائے تخت کی تبدیلی کے موقع پر ولی اورنگ آبادی، سراج اورنگ آبادی، داؤد اورنگ آبادی، عبدالولی عزلت، اسد علی خاں تمنا، لطف النساء امتیاز اور شیر محمد خان ایمان کی غزلیہ شاعری سے بھی قطعات کی دستیابی ممکن ہے۔ دبستانِ دہلی اور دبستان لکھنو کے شعراء نے بھی قطعہ لکھنے پر توجہ دی۔ شیخ ابراہیم ذوق کے ''اُردو کلیات'' میں چار مصرعوں پر مشتمل قطعات بھی دستیاب ہیں اور تیرہ و بیس اشعار پر مشتمل قطعات کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ فائز، یکرنگ ،مظہر جانِ جاناں، میر سوز، میر درد اور بہادر شاہ ظفر کے علاوہ غالب اور حالی کی شعر گوئی میں قطعات موجود ہیں۔ دہلی کے تمام غزل گو شعراء کی طرح لکھنو کے شعراء نے بھی قصائد اور غزلوں کے درمیان قطعات پیش کیے۔ سید انشاء، آتش و ناسخ ہی نہیں بلکہ واجد علی شاہ کے دور کے شعراء میں بھی لکھنو کو قطعہ کی روایت برقرار رکھنے کی خصوصیت حاصل ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر اور جدوجہد آزادی کے علاوہ آزادی کے بعد ہندوستان کے بیشتر شعراء نے قطعہ نگاری پر توجہ دی۔ قدیم شعراء کے کلام میں قطعہ گوئی کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی طرح عہد حاضر میں احسان دانش، سیماب اکبر آبادی، اختر انصاری، علامہ اقبال، فانی بدایونی اور دوسرے معاصرین شعراء نے بھی قطعہ نگاری میں کمال حاصل کیا اور آج بھی قطعہ نویسی کے مختلف انداز اُردو شاعری میں رائج ہیں۔ جس کی وجہ سے شعری اصناف میں قطعہ نگاری کے ذریعے نئے نئے مسائل اور موضوعات پر اظہار خیال کا سلسلہ شروع ہوا اور اسے مختصر نظم کی کیفیتی فضا بائدھنے میں کارآمد صنف کا درجہ حاصل ہے جو اختصار اور تسلسل سے وابستہ ہے۔

Scanned by CamScanner

قطعات

ازاکبر حسین اکبر الہ آبادی

اکبر حسین اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ء-۱۹۲۱ء) اُردو کے مشہور طنز و مزاح نگار شاعر تھے۔ انہوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔ انہوں نے اپنی نظموں میں مغربی تعلیم اور مغربی طرز زندگی کے علاوہ اس کے فیشن کی اندھی تقلید کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ سلاست، روانی، لطفِ بیان اور طنز و ظرافت ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری سے اصلاحِ معاشرہ کا کام لیا اور بیجا یوروپی طریقوں کو اختیار کرنے کی سخت مخالفت کی۔ ایشیائی تہذیب و ثقافت اور مشرقی اقدار کی پاسداری ان کی شاعری کا خصوصی حصہ ہے۔ اکبر کے موروثی اعلیٰ نیشاپور (ایران) سے ہندوستان آئے تھے۔ انگریزوں کی جنگِ پلاسی کے دوران اکبر الہ آبادی کے والد نے انگریز فوج میں بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ انہیں بنگال کا صوبیدار مقرر کیا گیا تھا۔ اکبر کی پیدائش ۱۶/ نومبر ۱۸۴۶ء کو الہ آباد ضلع کے بادہ مقام پر ہوئی۔ ان کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی۔ سماع کی محفلوں اور مجالس عزا میں شریک ہوتے تھے۔ گھر پر انہوں نے عربی، فارسی، اُردو، ریاضی اور انگریزی پڑھی۔ الہ آباد مشن اسکول میں داخل کیے گئے انہوں نے انگریزی کتاب ''فیوچر آف اسلام'' کا سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کیا۔ ملازمت کا آغاز منصفی میں عرضی نویس کے ذریعہ کیا۔ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان کامیاب کیا اور نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ عدالت خفیفہ کے منصفی کے عہدے پر مامور ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد اُردو زبان و ادب کی خدمت کی۔ ۱۹۲۱ء میں اکبر نے اس دارفانی سے کوچ کیا۔ ان کا ''کلیات''، ''مکاتیب اکبر'' اور ''فیوچر آف اسلام'' کا اُردو ترجمہ ان کی یادگار ہیں۔ ✪✪

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے، کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

قطعہ

از سر محمد اقبال

شیخ محمد اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) اُردو کے عہد آفریں شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں جنہوں نے نظم اور غزل ہی نہیں بلکہ قطعات کے ذریعہ اُردو شاعری میں فکر و فلسفہ اور اسلامی نظریے کی روح پھونکی۔ اسی لیے شاعر مشرق کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اقبال کی ولادت ۹/نومبر ۱۸۷۷ء کو بمقام سیالکوٹ ہوئی۔ اسکاچ مشن اسکول سے ۱۸۹۱ء میں مڈل کامیاب کیا اور یہیں سے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کامیاب کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے اور ۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم۔اے کیا۔ ۱۹۰۷ء میں میونخ یونیورسٹی جرمنی سے پی ایچ ڈی کی۔ ۱۹۰۸ء میں لندن سے ہندوستان آئے۔ ۱۹۰۹ء میں لاہور کالج میں فلسفہ کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں حکومت نے ''سر'' کے خطاب سے نوازا۔ دوسری گول میز کانفرس میں شرکت کی۔ پیرس اور اٹلی میں برگساں اور مسولینی سے ملاقات کی۔ ۱۹۳۷ء میں جامعہ ازہر کے علماء سے تبادلہ خیال کیا۔ ۱۹۲۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری حاصل کی۔ فارسی اور اُردو شاعری میں نام کمایا۔ اُردو میں ان کے شعری مجموعے ''بانگِ درا'' ''بال جبریل'' اور ''ضرب کلیم'' کے نام مشہور ہیں۔ اقبال نے ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ ان کی ابتدائی شاعری میں مناظر قدرت اور جذبات کی عکاسی شامل رہی پھر اقبال نے اسلامی فکر کو شاعری میں شامل کر کے نئے تصورات جیسے تصور عشق، تصور خودی، تصور فقر، تصور انسان کامل، تصور عورت اور تصور تعلیم کے ذریعے اُردو شاعری کو فکر و فلسفہ سے وابستہ کردیا۔ جس کی وجہ سے اُردو کے مفکر شاعر کی حیثیت سے اقبال کا مقام و مرتبہ کافی بلند ہے۔ اقبال نے اپنے قطعات میں بھی مسلم قوم کی بے راہ روی اور مذہب کی روح سے بیگانہ ہو کر زندگی گذارنے کو افسوسناک قرار دیا ہے۔ ✪✪

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدامست
یہ مذہب مُلّا و جمادات و نباتات

Scanned by CamScanner

حصۂ نثر

Scanned by CamScanner

داستاں

فارسی میں استعمال ہونے والا لفظ داستان ''پہلوی'' زبان سے فارسی میں منتقل ہوا۔ فارسی میں داستاں بھی رائج ہے جس کے معنی قصہ یا کہانی کے ہوتے ہیں۔ عربی میں قصہ اور ہندی میں کہانی کے لیے استعمال لفظ داستان کو عام قصہ یا کہانی سے مختلف درجہ اس لیے حاصل ہے کہ غیر محدود طوالت اور مافوق الفطرت عناصر کے بغیر داستان کا سفر ممکن نہیں۔ داستان درحقیقت کہانی در کہانی بیان کا ایسا طریقہ ہے جس میں بے شمار کہانیاں جنم لیتی ہیں اور ہر کہانی میں باہمی ربط ہوتا ہے۔ غیر یقینی واقعات، عجیب وغریب حالات اور سحر یا جادو کے توسط سے کہانی میں انہونے معاملے کو ہونے میں تبدیل کرنے کا وصف موجود ہوتا ہے۔ حیرت، جادو ٹونا، جن پری، دیو، راکشش اور عجیب وغریب مخلوقات پر مشتمل داستان میں بے شمار کردار اور ان کے ذریعہ حیرت میں ڈالنے والے کارنامے بیان ہوتے ہیں۔ ان تمام کا تعلق خیالی دنیا سے ہوتا ہے اس طرح خیالی قصے اور کہانیاں، انہونے واقعات، عجیب وغریب کردار کے ساتھ ساتھ مافوق الفطرت عناصر اور غیر فطری رویوں کا وجود کسی قصے میں موجود ہو تو اسے داستاں کہتے ہیں۔ ✪✪

داستاں کا فن

کہانی کی تمام ضرورتوں کا لحاظ داستاں میں رکھا جاتا ہے۔ ایک کہانی کے لیے ا۔ پلاٹ ۲۔ کردار ۳۔ مکالمہ ۴۔ منظر ۵۔ وحدت تاثر ۶۔ زماں ومکاں ۷۔ آغاز واختتام جیسے سات اجزا کی ضرورت ہوتی ہے۔ عام قصہ کی طرح داستان بھی اپنے آغاز سے نقطۂ عروج Climax تک پہنچتی اور اختتام پذیر ہوتی ہے۔ فرق صرف یہی ہے کہ عام کہانیوں میں زندگی کے قریب کے واقعات درج ہوتے ہیں جبکہ داستانوں میں ماورائی پرستان، عجیب و غریب ملک اور اس کے بادشاہوں اور عوام کا ذکر ہوتا ہے۔ داستانیں بھی تین انداز ا۔ المیہ ۲۔ طربیہ ۳۔ المطربیہ سے شروع ہوتی اور اسی انداز پر اختتام پذیر ہوتی ہیں۔ عام کہانی میں

تاریخی پس منظر

منظوم داستانوں کو چونکہ مثنوی کا موقف حاصل ہے۔ اس لیے اُردو کی اولین مثنویوں کے سلسلے میں منظوم داستانوں کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ نثر میں لکھی جانے والی سب سے پہلی داستان ''ملا وجہی'' کی ''سب رس'' ہے جو ۱۴۰۵ادوم ۱۶۳۵ء میں گولکنڈہ میں لکھی گئی۔ اس وقت گولکنڈہ پر قطب شاہی بادشاہوں کی حکمرانی تھی۔ وجہی نے ''سب رس'' میں جو طرزِ تحریر اختیار کیا ہے اسے مسجع ومقفیٰ نثر کہتے ہیں۔ دکن کی یہ مایہ ناز مثنوی کی زبان ''دکنی'' ہے جس کے بعد شمالی ہند میں عیوی خاں نے ''قصۂ مہر افروز ودلبر'' جیسی داستان تحریر کی۔ عطا محمد خاں تحسین کی داستان ''نوطرزِ مرصع'' ۱۷۷۵ تا ۱۷۸۱ء کی یادگار ہے۔ اُردو میں داستان نویسی کا باضابطہ آغاز فورٹ ولیم کالج کی خدمات سے ہوتا ہے۔ جسے ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ۱۸۰۰ء میں بمقام کلکتہ قائم کیا۔ جہاں انگریزوں کو اُردو سکھانے کے لیے عربی، فارسی اور سنسکرت سے قصہ کہانی کو ترجمہ کرکے اُردو میں پیش کیا گیا۔

Scanned by CamScanner

کردار مسائل کے درمیان بے بس ہوتا ہے جبکہ داستان میں دشواری اور پریشان حالی کے وقت کوئی تعویذ، جادوئی انگوٹھی یا اسمِ اعظم کے ورد سے مصیبت دور ہوجاتی ہے۔ ایسے ان ہونے رویوں کی وجہ سے داستان کی شناخت ہوتی ہے۔ داستان کا پلاٹ غیر مربوط اور قصہ در قصہ ترقی کرتا ہے۔ پیاز کی پرت کی طرح ایک چھلکا ختم ہو تو دوسرا برآمد ہوتا ہے۔ داستان کا سارا ماحول ماورائی اور شاہانہ ہوتا ہے۔ داستان کے کرداروں میں انسانوں کے علاوہ دیو راکشس، پری، دیوزاد اور عجیب و غریب مخلوقات ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کرداروں کو داستانوی اور دیومالائی کردار کہا جاتا ہے۔ جو اگر انسان ہوں تو اعلیٰ خاندانوں کے ہوتے ہیں اور کسی دوسری جنس سے تعلق رکھتے ہوں تو غصہ وجلال کی حالت میں ہوتے ہیں۔ داستانوں کے منظر طویل اور غیر فطری ہوتے ہیں جن میں مکالمے مختصر اور غیر واضح ہوتے ہیں۔ کہانی در کہانی قصہ ہونے کی وجہ سے داستان میں وحدتِ تاثر قائم نہیں ہوتا تاہم مرکزی اور ثانوی کردار ضرور ہوتے ہیں۔ داستانیں کسی زمانے اور کسی بھی وقت کی پابند نہیں ہوتیں اور داستاں کے مقامات اور بادشاہوں کے نام فرضی ہوتے ہیں اس لیے ان کی تاریخ میں تلاش دشوار ہے کیونکہ سارا قصہ خیالی ہوتا ہے البتہ داستاں کا آغاز مناسب اور کہانی کے نقطۂ عروج پر اختتام ہوتا ہے۔ اُردو کے داستاں نگاروں نے المیہ، طربیہ اور الم طربیہ ہر قسم کی داستانیں لکھیں۔ ناول اور افسانے کے وجود کے بعد داستاں نگاری روبہ زوال ہوئی۔

فورٹ ولیم کالج کی داستانوں میں باغ و بہار (میر امن) آرائش محفل و طوطا کہانی (حیدر بخش حیدری) داستان امیر حمزہ (خلیل خاں اشک) بیتال پچیسی (مظہر علی خاں ولا) شکنتلا (للولال جی کوی) وغیرہ مشہور ہوئیں۔ فورٹ ولیم کالج کی باہر کی داستانوں میں ''رانی کیتکی اور اودے بھان'' مشہور داستان ہے۔ کلکتہ میں جس طرح انگریزوں نے فوٹ ولیم قائم کیا۔ اسی طرح مدراس میں فوٹ سینٹ جارج کالج قائم کیا گیا۔ جس کے ذریعہ بھی داستانوں کا فروغ ہوا۔ اس دور میں بھی مسجع اور مقفی عبارت ہی داستان لکھنے کے لیے مشہور رہے چنانچہ انگریز گورنر جورٹ کلکٹ نے ۱۷۱۷ء میں پندرہ تا اٹھارہ سال کی عمر کے منشیوں کی تربیت کے لے فورٹ سینٹ جارج کالج کی بنیاد رکھی۔ جہاں ابراہیم بیجاپوری نے دکنی انوار سہیلی کا ترجمہ کیا۔ منشی شمس الدین احمد نے داستاں الف لیلی کا ترجمہ کیا۔ اس کالج سے وابستہ دوسرے مترجمین میں منشی مظفر اور غلام دستگیر کا شمار ہوتا ہے یہ کالج ۱۳۷ سال تک قائم رہا۔ اس کے باقی رہنے کی تاریخ ۱۸۵۴ء بتائی جاتی ہے۔ لکھنو کی داستانوں میں سب سے مشہور داستان ''فسانۂ عجائب'' ہے جسے ۱۸۲۴ء میں رجب علی بیگ سرور نے تحریر کیا۔ اٹھارہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے آغاز تک اُردو نثر پر داستانوں کا غلبہ رہا۔ دہلی، لکھنو کے بعد بھوپال میں بھی داستانوں کی ترقی کا سلسلہ جاری رہا۔ داستانِ امیر حمزہ، طلسم ہوش ربا، طلسم خیال سکندری ہی نہیں بلکہ عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں سے بے شمار داستانیں اُردو میں ترجمہ کی گئیں۔ حقیقت پسندی کے دور کے آغاز کے ساتھ ہی داستانوں پر زوال آیا۔ اس وقت تک اُردو میں حکایت Fable روایت Parable، تمثیل Allegory۔ دیومالا (اساطیر) Myths، پریوں کی کہانیاں Fairy Tales، جاتک کتھائیں Ceremony Tales، داستان Romance اور Legend کا رواج عام رہا۔ خیالی دنیا کے بجائے انسان کی حقیقی دنیا سے بڑھتی ہوئی محبت کی وجہ سے داستان کو زوال ہوا اور اس کے بجائے ناول اور افسانے کو عروج حاصل ہوا۔

Scanned by CamScanner

داستان

انتخابِ سب رس

ملا وجہی

ملا وجہی دکن کے قطب شاہی خاندان کے زمانۂ حکومت میں ابراہیم قلی قطب شاہ کے دربار کے مشہور شاعر اور نثر نگار تھے۔ نظم میں ان کی مثنوی قطب مشتری اور نثر میں سب رس قابلِ ذکر تصنیفات ہیں۔

سب رس عرف قصۂ حسن و دِل ۱۰۰۵ھ مطابق ۱۶۳۵ء میں لکھی گئی۔ یہ قدیم اُردو نثر کی اولین ادبی تصنیف ہے جس میں حسن و عشق کا قصہ تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ تمثیل میں انسانی کیفیات و تصورات مثلاً خوشی، غم، نیکی بدی وغیرہ کو مجسم کیا جاتا ہے اور وہ زندہ و متحرک کرداروں کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

وجہی کہانی سناتے ہوئے انشائیہ نگاری کا کمال بھی دکھاتے ہیں اور تصوف کے مسائل اور پند و اخلاق کی باتیں بڑے دلنشین انداز میں بیان کرتے ہیں۔ یہ نصائح فکر انگیز بھی ہوتے ہیں اور سبق آموز بھی۔ ان کی نثر مقفیٰ ہوتی ہے۔ یہ ایک مشکل طرزِ بیان ہے اور اس میں تکلف اور تصنع کے در آنے کے پورے امکانات ہوتے ہیں مگر سب رس میں اکثر مقامات پر قافیوں کی پابندی کے باوجود غضب کی روانی پائی جاتی ہے جس سے وجہی کی قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ ذیل کے اقتباس سے ہم نہ صرف وجہی کے اخلاقی تصورات سے واقف ہوتے ہیں بلکہ ہمیں ان کے عہد کی دکھنی زبان کا بھی علم ہوتا ہے۔ یہ زبان آج بھی کرناٹک، تلنگانہ اور مہاراشٹر کے دیہاتوں میں بولی جاتی ہے۔ ✪✪

Scanned by CamScanner

۱۔ جھوٹ مت بولو

مصلحت سوں چلتا دنیا کا کارخانہ، کہیں سچا بول، کہیں جھوٹا بہانہ۔ ولے جھوٹے کوں سب کوئی چھاتے، نچ کی بات کوئی خاطر نمیں لیاتے۔ جھوٹا دنیا میں بھوچ بھاتا۔ جھوٹا نیئں بھوئی سو بات کاڑے۔ جھوٹا دو میں عداوت پاڑے۔ جھوٹے کا دین دنیا میں موں کالا۔ جھوٹا اپنے دل تے باتاں جورے، جھوٹا لوکاں کے گھراں پھوڑے۔ جھوٹے کی میں کیا کہوں بات، خدا پناہ دیوے! جھوٹا ہے شیطان کی ذات۔

۲۔ ہر حال میں خوش رہو

جسے دیا میں غم نیئں وو نادر ہے۔ خوشی غم سب مردانچ کے بر ہے۔ چلتا سوچ اُڑتا ہے۔ چڑتا سوچ پڑتا ہے۔ لموار کا کھیل جو آگ سوں ہے تو یکا دھے وقت جلتابی ہے۔ تیرالو جو دائم پانی میں غوطہ مارتا کدھیں دم کوں گھٹریا جاتملتابی ہے۔ بادشاہاں جو بادشاہی کرتے ہیں، حکومت کا دعوٰی کرتے ہیں انو بھی کدھیں غمگین، کدھیں خوشحال، ایسیاں کا بی یو حال، دکھ سوسیا سومرد، غم کے وقت خوشحال رھیا سومرد۔ گنگابی دھوپ کالے میں نمنی، برشگالی میں بڑی، جنگل کا جھاڑ، اسے کدھیں پھول پھل، کدھیں پت جھڑی۔ اگر دائم اچھے ایک وضا تو عبث ہے یو قدر قضا۔ یو اس کا ہچ ذات ہے جو دائم ایک دھات ہے۔

۳۔ طمع سے پرہیز کرو

بھوت طمع تے بھوت ہے زیان۔ بھوت طمع تے عزت کوں نقصان۔ بھوت طمع تے رہتا نمیں مان۔ بھوت طمع تے آدمی دین گنواتا ہے۔ بھوت طمع تے آدمی کا ایمان جاتا ہے۔ طمع تے آدم کوں بہشت سے کاڑے۔ طمع تے آدم پر یو بلا پاڑے۔ جس کے بڑیاں پر طمع تے یو لیائے خواری، انوں کے فرزنداں سوں کیا کرے گی وفاداری۔ طمع کا آدمی بر نمیں اُچاتا۔ جاں جاتا سر نواتا۔ جس کے سر پر طمع کا بھار، اس کا سر دائم ہلار۔

۴۔ دنیا پرستی سے بچو

اس دنیا خاطر لوکاں نے ماں باپ کوں مارے ہیں۔ سگے بھایاں نے سگے بھایاں سوں عداوت سہارے ہیں۔ دنیا ماں، دنیا باپ، دنیا بھائی، آخر یہ دنیا کس کی ہوئیں آئی۔ ونیا کے لوکاں بھوت مست، بھوت بیخبر، خدا رسول اُنو کدھر، انو کا ماں باپ، انو کا خدا رسول سوزر۔ سگے بھائی کوں یاں پتیا یانا جائے۔ نفر چاکر تو بیگانہ، نفر چاکر پر ایکا یک کیوں پتیارا آئے؟ دنیا میں ہر یک کام کوں وسیلے بھوت ہیں۔ دنیا دغاباز ہے، دنیا میں مکر اور حیلے بھوت ہیں۔ دنیا تماشے کی ٹھار ہے، ولے جکوئی عاقل ہے وو اپنی جا گا بھوت ہُشیار ہے۔ در و دیوار تے بچکنے کی جا گا ہے۔ اپنے جیو کے یار تے بچکنے کی جا گا ہے۔

۵۔ نیکی کرو

دنیا کی عزت مال سو ہے ہور عاقبت کی عزت اعمال سوں ہے۔ مال نے اعمال پیدا کر لینا ہے۔ جوں یہاں کی خاطر مال پیدا کرتے تیوں وہاں کی خاطر اعمال پیدا کر لینا ہے۔ مفلسی کسے نئیں بھاتی۔ نہ یہاں کام آتی نہ وہاں کام آتی۔ دوست وو جو دلسوزی کرے۔ مفلسی خدا دشمن کوں نہ روزی کرے۔ اگر جانتا ہے کہ جیوں یہاں ہے تیوں وہاں بی کچ ہے۔ تو نیکی پر چت دھر، نیکی نکو بسَر۔ اگر جانتا ہے پھیچ ہے، انگے کچ نئیں تو خوشی بھائے سو کر۔ پیغمبراں نے تو یوں دیے ہیں خبر، اگر کچ سمجھیا ہے تو نیکی کر۔ باپ نہ چھڑائے گا نہ ماں چھڑائے گی۔ جاں تاں تیری نیکی تیرے انگے آئے گی۔

۶۔ ماں باپ کی عزت کرو

ماں باپ مجازی خدا۔ انو کے حکم تے کیوں ہونا جُدا۔ انو پرورش کیے، انو بڑھائے، انو سوں بے ادبی کیوں کریا جائے۔ انو خوش تو خدا رسول راضی۔ انو خوش تو ہر دو جہاں میں فتح بازی۔ انو کوں راضی رکھنا، انو کی دُعا لینا، یے بھوت ادب کی ٹھاؤں ہے۔ تو چ لگن خوبی ہے جو لگن سر پر انو کی چھاؤں ہے۔ ماں باپ کی مہر دوسرے میں نا آسی۔ یو ہر کوئی دُسرے میں نا پاسی۔ بڑا مکہ بڑا مدینہ سو ماں

Scanned by CamScanner

باپ۔ صُبا اُٹھ، انو کاموں دیکھے تو جھڑتے سب پاپ۔ جو ماں باپ کی رضا میں چلتا ہے، وو ادب دار، بھوت نیک بخت۔ برخوردار۔

۷۔ جلد بازی اور غرور سے بچو، صبر اور شُکر سے کام لو

خدا کو یو دو باتاں نمیں بھاتیاں، یو دو باتاں کام نمیں آتیاں۔ ایک بیگی، دوسری غروری۔ بندہ وو ہیچ جس میں کُچ غریبی، جس میں کُچ صبوری۔ جن نے بیگی کیا، ان نے گنوایا۔ جن نے صبوری کیا، ان نے کُچ پایا۔ بیگی میں مقصود گنوایا جاتا ہے۔ صبوری میں ہر یک کام نکل کر آتا ہے۔ اگر اُسمان تے آگ برسائے گا اُبر، وھاں بی کام کرے گا شُکر ہور صبر۔ شکر ہور صبر ہر یک درد کا دارو ہے۔ شُکر ہور صبر محنت کے دریا کا اُتارو ہے۔ شکر ہور صبر تے ہر یک مشکل آسان ہوتا ہے۔ شُکر ہور صبر کرن ہارے پر خدا مہربان ہوتا ہے۔ جس پر جو کُچ بلا آتی ہے۔ شُکر ہور صبر کرنے تے سب جاتی ہے۔

۸۔ عقل کی فضیلت

عقل نور ہے۔ عقل کی دوڑ بھوت دور ہے۔ عقل ہے تو اُدمی کہواتے۔ عقل ہے تو خدا کوں پاتے۔ عقل اچھے تو تمیز کرے، بُرا اور بھلا جانے۔ عقل اچھے تو اپس کوں ہور دُسرے کوں پچھانے۔ عقل تے میر، عقل تے پیر، عقل تے پادشاہ، عقل تے وزیر، عقل تے دنیا، عقل تے دولت، عقل تے چلتی سلطاناں کی سلطنت، عقل تے رھیا ہے یو عالم کھڑیا۔ جس میں بھوت عقل وو بھوت بڑا۔ عقل بغیر دل کوں نور نمیں۔ عقل کو خدا کنا بی کُچ دور نمیں۔

معانی واشارات

۱		۳	
سوں	...... سے	زیان	...... زیاں، نقصان
کہیں	...... کہیں	خوشی بھائے سوکر	...... جو جی چاہے کر
ولے	...... لیکن	جاں تاں	...... جہاں تہاں، ہر جگہ
کوں	...... کو	۴	......
پتیانا	...... بھروسہ کرنا	عداوت سارنا	...... دشمنی کرنا
نئیں	...... نہیں	نفر	...... نوکر
بھوتیچ	...... بہت ہی	چاکر	...... نوکر
کاڑنا	...... نکالنا	پتیارا	...... بھروسہ
موں	...... منہ	ٹھار	...... جگہ
تے	...... سے	جکوئی	جوکوئی، جو شخص
۲		جاگا	...... جگہ
وو	...... وہ	ترچکنا	...... بدکنا، ڈرنا
نادر	...... کمیاب	جیو کے یار	...... قریبی دوست
مردانچ کے	...... مردوں ہی کے	۵	......
چڑنا	...... چڑھنا	ھور	...... اور
سوچ	...... س+چ=وہی	کسے	...... کسی کو
چلتا سوچ اُڑتا ہے	...... چلنے والے ہی کو رکاوٹ پیش آتی ہے	دلسوزی	...... ہمدردی
			......
پڑنا	...... گرنا	روزی کرنا	...... نصیب کرنا
لھوار	...... لوہار	کچ	...... کچھ

Scanned by CamScanner

چت دھرنا ...... دل لگانا، دھیان کرنا   نھنی ...... نھنی۔ چھوٹی

برشگال ...... برسات

وسرنا ...... بھولنا   ٦

نکو   نہیں، مت

انگے ...... آگے   بڈھانا ...... بڑھانا، بڑا کرنا

بیچ ...... بیچ، مراد بیچ دنیا   ٹھاؤں ...... جگہ

یکادھے ...... ایک آدھ وقت۔ کبھی کبھی   توچ لگن ...... وہیں تک

وقت

بی ...... بھی   نا آسی ...... نہیں آئے گی

('سی' علامت مستقبل ہے)

تیرالو ...... تیراک

برشگالی میں ...... برسات میں   ناپاسی ...... نہیں پائے گی "

اچھے ...... ہو، رہے   صبا ...... صبح

وضا ...... وضع، ڈھنگ   برخوردار ...... فائدہ اُٹھانے والا

کاچ ...... (کا+چ) کا ہی   ۷

دھات ...... وضع، انداز   بیگی ...... جلد بازی

کدھیں ...... کبھی   اسمان ...... آسمان

دم کونڈیا جانا ...... دم گھٹنا   دارو ...... دوا، علاج

تلملنا ...... تڑپنا، تلملانا   اتارو ...... مسافر

الو ...... وہ   کرن ہارا ...... کرنے والا

ایسیاں ...... ایسوں   ۸

یو ...... یہ

سوسنا ...... برداشت کرنا   کہوائے ...... کھلائے

اپس کوں ...... اپنے آپ کو

Scanned by CamScanner

اَدی	...... آدمی	کنا	...... کہنا
		دور نہیں	بعید نہیں، تعجب نہیں
بڑیاں	...... بڑے کی جمع،		
	بڑے لوگ		
اُچانا	...... اُٹھانا		
جاں	...... جہاں		
سرنوانا	...... سرجُھکانا		
تلار	...... نیچے		

Scanned by CamScanner

ناول

اطالوی زبان کے لفظ Novella کو جب انگریزی زبان نے اپنایا تو اسے ناول میں تبدیل کردیا۔ انگریزی سے اُردو میں یہ لفظ جوں کا توں استعمال کیا گیا۔ جس کے معنی ''انوکھا'' یا نرالا کے ہیں۔ قصے یا کہانی کا ایسا انداز جس میں زندگی کی قریب کی حقیقتوں کو خیالی سطح پر ایسا بیان کیا جائے کہ وہ حقیقت نہ ہوتے ہوئے بھی حقیقت کی نشاندہی کرے۔ ایسے قصہ یا کہانی کو ناول کہا جاتا ہے۔ کسی قصہ یا کہانی میں زندگی کے قریب کے کردار جو خیالی انداز سے پلاٹ میں شامل کیے جاتے ہیں اور جن پر حقیقت کا گمان ہو اسے ناول کا موقف حاصل ہے۔ قصہ میں ندرت کو شامل کرتے ہوئے کرداروں اور ان کے عمل کا مربوط بیان میں پیش کرنا ''ناول'' ہے۔ جو حقیقت نہ ہوتے ہوئے بھی حقیقت کی جھلکیاں پیش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ناول وسیع کینوس کا احاطہ کرتا ہے۔ اس لیے ناول میں مافوق الفطرت عناصر اور کردار کا دخل نہیں۔ ناول کا قصہ۔ پلاٹ، کردار اور مناظر سب کچھ خیالی ہونے کے باوجود حقیقت کی گنجائش باقی رکھتے ہے اور اسی حقیقت کی بنیاد پر ناول کو داستان سے مختلف صنف نثر کا درجہ حاصل ہے۔ ✪✪

ناول کا فن

ناول میں ایسے قصہ یا کہانی کو پیش کیا جاتا ہے جس میں زندگی کے حقائق ملتے ہیں۔ عقلی اعتبار سے سماج میں پیش آنے یا پیش آئے ہوئے واقعہ کو بھی ناول کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں حقیقت نگاری کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ ناول زیادہ طویل نہیں ہوتا۔ کسی ناول کو لکھنے کے لیے ا۔ کہانی ۲۔ پلاٹ ۳۔ کردار ۴۔ مکالمے ۵۔ زماں و مکاں یا پس منظر ۶۔ نظریۂ حیات ۷۔ اسلوب کے علاوہ کسی بھی کہانی کی طرح کسی بھی ناول میں ابتداء، عروج اور تصادم کے ساتھ ساتھ اختتام کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ناول کے کرداروں میں بھی کشمکش کا انداز موجود ہوتا ہے۔ ناول کے کرداروں میں زندگی

تاریخی پس منظر

اُردو ادب میں ناول کی شروعات سے قبل قصہ کہانی کے روپ میں داستانیں لکھی جاتی تھیں داستانوں میں موجود جادو۔ مافوق الفطرت عناصر۔ واقعات اور صرف اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کی وجہ سے انہیں زندگی کی موثر نمائندگی کا موقف حاصل نہ ہوسکا۔ زندگی اور انسان کی بدلتی ہوئی فطرت اور دلچسپیوں کی نمائندگی ناول کے ذریعہ ہونے لگی۔ اُردو میں ناول کے انداز پر جو قصے لکھے گئے انہیں تمثیل کا نام دیا گیا۔ اُردو کے پہلے ناول کی حیثیت سے کسی کتاب کو قبول کرنے کے بارے میں بھی اختلاف رہا۔ مولوی کریم الدین کے قصے ''خط تقدیر'' کو پہلے ناول کی حیثیت پیش کیا گیا جبکہ ۱۸۶۹ء میں ڈپٹی نذیر احمد کے تحریر کردہ قصہ ''مراۃ العروس'' کو اُردو کے پہلے ناول کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ غرض اُردو میں ناول لکھنے کی اولیت کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر جاتا ہے۔ مراۃ

Scanned by CamScanner

کی قربت اور تحریک کا ہونا ضروری ہے۔ اچھے ہر قسم کے کرداروں کی عکاسی ناول میں ہو سکتی ہے۔ ناول کا پلاٹ چست اور ...وں کی جا سکتی ہے۔ مکالمے مختصر اور جامع کے ...ہونا چاہیے۔ ساتھ ساتھ برموقع اور متاثر کن ہونے چاہییں۔ نیکی اور سچائی کی ازلی فتح اور برائی کے علاوہ ہر قسم کی بے راہ روی کے خاتمے کے لیے کرداروں کے ذریعہ پلاٹ میں تصادم کو شامل کیا جاتا ہے۔ تصادم یا ٹکراؤ کا لمحہ ناول میں اس وقت آتا ہے جب کہانی نقطۂ عروج کو پہنچتی ہے۔ پلاٹ وہ بنیادی ضرورت ہے جو کہ کرداوں میں آپسی ربط و ضبط کے ذریعہ کہانی کا آغاز اور ان کے کرداروں میں اختلاف کی وجہ سے نقطۂ عروج اور تصادم کی فضا تیار کرتا ہے جس کے بعد کہانی کو کسی ایک نقطہ پر لے جا کر اختتامی مرحلہ پیدا کیا جاتا ہے۔ خوشی پر ختم ہونے والا مرحلہ طربیہ Comedy اور غم پر ختم ہونے والا مرحلہ المیہ Tragedy اور خوشی و غم کے ملے جلے تاثرات پر ختم ہونے والا مرحلہ الم طربیہ Tragedic Comedy کہلاتا ہے۔ کسی کہانی کے پلاٹ میں موجود کردار اور ان کے رویوں کے ذریعہ تصادم کی فضا تیار ہوتی اور کہانی کا کسی ایک رخ کی جانب مڑ جانا نقطۂ عروج اور تصادم کی علامت ہے جب کہ تصادم کے اختتام کے بعد کہانی کا کسی ایک نتیجہ خیز مرحلہ پر اختتام پذیر ہونا انجام کہلاتا ہے۔ اس طرح ہر ناول بنیادی طور پر آغاز، نقطۂ عروج، تصادم، تصادم میں کمی کے بعد نتیجہ خیزی اور اختتام کے ذریعہ کہانی کے انجام پر کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس ناول میں یہ تمام خوبیاں شامل ہوں گی وہ کامیاب ناول سمجھا جاتا ہے۔

العروس، بنات النعش، ابن الوقت، توبۃ النصوح، ایاٰمیٰ، رویائے صادقہ جیسی کتابوں میں ناول کے عنصر کی موجودگی کو متفقہ طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ناول ''فسانۂ آزاد'' کو اُردو کے دوسرے اہم ناول کا درجہ حاصل ہے۔ جبکہ سرشار نے پی کہاں، کڑم دھڑم، چھچڑی دلہن، خدائی فوجدار ناول بھی لکھے۔ عبدالحلیم شرر نے اُردو میں تاریخی ناول نگاری کی بنیاد رکھی۔ شرر کے ۲۶ ناولوں میں ''فردوس بریں'' ملک العزیز ورجینا، فلورا فلورنڈا۔ حسن کا ڈاکو، فتح اندلس وغیرہ اہم ناولوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مرزا محمد ہادی رسوا نے اُردو ناول کو ایک نئی جہت عطا کی اور انہوں نے طوائف کی زندگی پر ناول لکھ کر ''امراؤ جان ادا'' کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ علامہ راشد الخیری کو مصور احوال غم کا لقب دیا گیا۔ انہوں نے غمگین ناول نگاری کی بنیاد رکھی۔ سیدہ کا لال۔ آمنہ کا لال۔ صبح زندگی اور شام زندگی کے علاوہ سراب مغرب جیسے ناولوں کی وجہ سے شہرت حاصل۔ منشی فیاض علی کا ناول ''انور'' بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اُردو ناول نگاری میں منشی پریم چند کے ناولوں نے نئی تبدیلی لائی۔ دیہات کا ماحول، کسان کی کسمپرسی، جد و جہد آزادی کے علاوہ انسانی رویوں کی جھلکیاں ان کے ناولوں میں نمایاں ہیں۔ گئودان، نرملا، بازار حسن، جلوۂ ایثار، گوشۂ عافیت، میدانِ عمل اور بیوہ ان کے مشہور ناول ہیں جن میں سماجی مسائل اور بھید بھاؤ کے علاوہ کسانوں کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ نیاز فتح پوری نے ''شہاب کی سرگزشت'' اور ''شاعر کا انجام'' ناول پیش کر کے رومانی ناول نگاری کا آغاز کیا۔ جس کے بعد ترقی پسند ناول نگاروں نے ہر قسم کی حقیقتوں کو ناولوں میں پیش کیا۔ ناول ''شکست'' کرشن چندر) ٹیڑھی لکیر (عصمت چغتائی)۔ گریز (عزیز احمد) لندن کی ایک رات (سجاد ظہیر) کے ناولوں نے ادب میں اہم مقام حاصل کیا جس کے بعد قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا''۔ ''میرے بھی صنم خانے'' کو شہرت حاصل ہوئی۔ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی نے اُردو میں مزاحیہ ناول کی بنیاد رکھی۔

Scanned by CamScanner

ناول سے انتخاب

نصوح کی سلیم سے گفتگو

ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۶ء۔۱۹۱۲ء) اُردو نثر کو داستانوی دور سے نکال کر ناول سے وابستہ کرنے والے ادیبوں میں ڈپٹی نذیر احمد پیش پیش ہیں۔ان کی پیدائش بجنور میں ہوئی لیکن دلی میں تربیت پائی۔دہلی کا ٹھیٹھ کرخنداری کا لہجہ ان کی نثر میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔اُردو میں تمثیلی قصے لکھ کر ناول نگاری کی بنیاد رکھی۔ان کے بیشتر ناول اخلاقی اور مشرقی اقدار کی نمائندگی کرتے ہیں۔جنہیں انہوں نے اپنی اولاد کی تربیت کے لیے لکھا تھا۔ان کی لکھی ہوئی کتابوں پر انگریزی حکومت سے اعزازات بھی حاصل ہوئے۔ڈپٹی نذیر احمد نے اُردو کا پہلا قاعدہ ''صرف صغیر'' لکھا اور ہندوستانی قانون کے اصولوں کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کر کے ''تعزیرات ہند'' کا نام دیا۔مسجد کے مولوی کے گھر تربیت پائی تھی اور ان کی صاحبزادی سے شادی کی تھی۔جس کی وجہ سے ان کی نثر پر ''مولویانہ اثرات'' کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔انہوں نے اپنے تمام ناولوں کے نام عربی تراکیب کے ساتھ لکھے۔مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، فسانۂ مبتلا، ایامی، رویائے صادقہ، ابن الوقت جیسے ناول ان کی عربی دانی کا ثبوت دیتے ہیں۔ان کے ناولوں کا مقصد نئی نسل کو مغربی تہذیب کی گمراہی سے بچانا، مذہبی بیداری اور اصلاح معاشرہ رہا۔انہوں نے تمام ناولوں میں مشرقی تہذیب کی حمایت اور یورپ کی تقلید پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔''ابن الوقت'' کو ان کے شاہکار ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے جس میں انہوں نے مشرقی تہذیب سے محبت اور مغربی تہذیب سے چھپ چھپ کر پیار کرنے کا انداز اختیار کیا ہے۔توبۃ النصوح، ان کے اخلاقی ناولوں میں اہم ناول قرار دیا جاتا ہے۔جس میں مذہب بیزاری کے برے نتائج اور اخلاق و تہذیب سے وابستگی کی وجہ سے سدھار کے روشن امکانات کی نشاندہی کی گئی ہے۔زیر نظر مضمون میں بھی اخلاقی باتوں کی تعلیم دی گئی ہے اور یہ اقتباس ڈپٹی نذیر احمد کے مشہور ناول ''توبۃ النصوح'' سے منتخب کر کے طلبہ کے مطالعہ کے لیے پیش کیا گیا ہے۔✪✪

سلیم ابھی سو کر بھی نہیں اُٹھا تھا کہ بیدارا نے آ جگایا کہ ''صاحبزادے اُٹھیے بالا خانے پر میاں بلاتے ہیں''۔سلیم کی عمر اُس وقت کچھ کم دس برس کی تھی۔سلیم نے جو طلب کی خبر سُنی گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور

Scanned by CamScanner

جلدی سے ہاتھ مُنہ دھو ماں سے آکر پوچھنے لگا اما جان تم کو معلوم ہے آبا جان نے کیوں بلایا ہے۔
ماں ''۔ ''بھائی مجھکو تو کچھ خبر نہیں''۔ بیٹا۔ ''کچھ خفا تو نہیں ہیں''۔ ماں ''ابھی تو کوٹھے پر سے بھی نہیں
اترے''۔ سلیم ''بیدارا تجھکو کچھ معلوم ہے'' بیدارا'' میاں میں اوپر لوٹا لینے گئی تھی میاں اکیلے بیٹھے ہوئے
کتاب پڑھ رہے تھے۔ میں آنے لگی تو میاں نے آپ کا نام لیا اور کہا ان کو بھیج دو۔ ''سلیم'' صورت سے
کچھ غصہ تو نہیں معلوم ہوتا تھا'' بیدارا'' ''نہیں تو'' سلیم تو اما جان ذرا تم بھی میرے ساتھ چلو۔ ماں
''میری گود میں لڑکی سوتی ہے تم اتنا ڈرتے کیوں ہو، جاتے کیوں نہیں''۔ سلیم ''کچھ پوچھیں گے'' ماں
''جو کچھ پوچھیں گے تم اس کا معقول طور پر جواب دینا''۔ غرض سلیم ڈرتا ڈرتا اوپر گیا اور سلام کر کے الگ
جا کھڑا ہوا۔ باپ نے پیار سے بلا کر پاس بٹھا لیا اور پوچھا ''کیوں صاحب! ابھی مدرسے نہیں گئے''۔
بیٹا ''جی بس اب جاتا ہوں ابھی کوئی گھنٹے بھر کی دیر'' اور باپ ''تم اپنے بھائی کے ساتھ مدرسے جاتے ہو
یا الگ'' بیٹا ''کبھی کبھار بھائی جان کے ساتھ چلا جاتا ہوں ورنہ اکثر اکیلا جاتا ہوں'' باپ ''کیوں بیٹا
اگلے مہینے امتحان ہونے والا ہے چھوٹے بھائی جان اُسی کے واسطے تیاری کر رہے ہیں صبح سویرے اُٹھکر
کسی ہم جماعت کے یہاں چلے جاتے ہیں وہاں اُن کو دیر ہو جاتی ہے تو پھر گھر بھی نہیں آتے میں جاتا
ہوں تو اُن کو مدرسے میں پاتا ہوں''۔ باپ ''کیا اپنے گھر میں جگہ نہیں ہے کہ دوسروں کے یہاں جاتے
ہیں''۔ بیٹا ''جگہ تو ہے مگر وہ کہتے تھے کہ یہاں بڑے بھائی جان کے پاس ہر وقت گنجفہ اور شطرنج ہوا کرتا
ہے اطمینان کے ساتھ پڑھنا نہیں ہو سکتا''۔ باپ ''تم بھی شطرنج کھیلنی جانتے ہو''۔ بیٹا ''مہرے پہچانتا
ہوں چالیں جانتا ہوں مگر کبھی خود کھیلنے کا اتفاق نہیں ہوا''۔ باپ ''مگر زیادہ دنوں تک دیکھتے دیکھتے یقین
ہے کہ تم بھی کھیلنے لگو گے''۔ ''بیٹا شاید مجھکو عمر بھر بھی شطرنج کھیلنی نہ آئیگی''۔ باپ ''کیوں کیا ایسی
مشکل ہے'' بیٹا ''مشکل ہو یا نہ ہو میرا جی ہی نہیں لگتا''۔ باپ ''سبب'' بیٹا ''میں پسند نہیں کرتا'' باپ
''چونکہ مشکل ہے اکثر مبتدی گھبرایا کرتے ہیں مجھ کو یقین ہے کہ گنجفہ میں تمہاری طبیعت خوب لگتی ہوگی وہ
بہ نسبت شطرنج کے بہت آسان ہے''۔ بیٹا ''میں شطرنج کی نسبت گنجفہ کو زیادہ تر ناپسند کرتا ہوں''۔ باپ
''ہاں شطرنج میں طبیعت پر زور پڑتا ہے اور گنجفہ میں حافظہ پر'' بیٹا ''میری ناپسندیدگی کا کچھ خاص کر یہی

Scanned by CamScanner

سب نہیں ہے بلکہ مجھکو سارے کھیل بُرے معلوم ہوتے ہیں"۔ باپ "تمہاری اِس بات سے مجھکو تعجب ہوتا ہے اور میں تم سے تمہاری ناپسندیدگی کا اصلی سبب سننا چاہتا ہوں کیونکہ شاید اب سے پانچ یا چھ مہینے پہلے جن دنوں میں باہر کے مکان میں بیٹھا کرتا تھا، میں نے خودتم کو ہر طرح کے کھیلوں میں نہایت شوق کے ساتھ شریک ہوتے دیکھا تھا"۔ بیٹا "آپ درست فرماتے ہیں، میں ہمیشہ کھیل کے پیچھے دیوانہ بنا رہتا تھا مگر اب تو مجھ کو ایک دلی نفرت ہوگئی ہے۔ باپ "آخر اُس کا کوئی سبب خاص ہوگا"۔ بیٹا "آپ نے اکثر چار لڑکوں کو کتابیں بغل میں داب اندر گلی میں آتے جاتے دیکھا ہوگا"۔ باپ "وہی جو گورے گورے چار لڑکے ایک ساتھ رہتے ہیں۔ چھڈی جوتیاں پہنے، مڑھے ہوئے سر، اونچے پائجامے، نیچی چولیاں" بیٹا "ہاں جناب وہی چار لڑکے" باپ "پھر" بیٹا بھلا آپ نے کبھی اُن لڑکوں کی راہ میں چلتے ہیں تو گردن نیچی کیے ہوئے اپنے سے بڑا مل جائے جان پہچان ہو یا نہ ہو ان کو سلام کر لینا ضروری کئی برس سے اس محلے میں رہتے ہیں مگر کانوں کان خبر نہیں۔ محلے میں کوڑیوں لڑکے بھرے پڑے ہیں لیکن اُن کو کسی سے کچھ واسطہ نہیں۔ آپس میں اوپر تلے کے چاروں بھائی ہیں نہ کبھی لڑتے، نہ کبھی جھگڑتے، نہ گالی بکتے، نہ قسم کھاتے، نہ جھوٹ بولتے، نہ کسی کو چھیڑتے، نہ کسی پر آوازہ کستے۔ ہمارے ہی مدرسے میں پڑھتے ہیں وہاں بھی ان کا یہی حال ہے کبھی کسی نے اُنکی جھوٹی شکایت بھی تو نہیں کی۔ ڈیڑھ بجے ایک گھنٹے کی چھٹی ہوا کرتی ہے۔ لڑکے کھیل کود میں لگ جاتے ہیں۔ یہ چاروں بھائی ایک پاس کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں" باپ "بھلا پھر" بیٹا "منجھلا لڑکا میرا ہم جماعت ہے ایک دن میرا آموختہ یاد نہ تھا۔ مولوی صاحب نہایت ناخوش ہوئے اور اُس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے فرمایا کہ کمبخت گھر ملا ہے اسی کے پاس جا کر یاد کر لیا کر۔ میں نے جو پوچھا کیوں صاحب یاد کروا دیا کرو گے تو کہا بسر و چشم۔ غرض میں اگلے دن اُن کے گھر گیا آواز دی انہوں نے مجھ کو اندر بلا لیا دیکھا کہ ایک بہت بوڑھی سی عورت، تخت پر جائے نماز بچھائے قبلہ رو بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی ہیں، وہ اُن لڑکوں کی نانی ہیں۔ لوگ اُن کو حضرت بی کہتے ہیں۔ میں سیدھا سامنے دالان میں اپنے ہم جماعت کے پاس جا بیٹھا۔ جب حضرت بی اپنے پڑھنے سے فارغ ہوئیں تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ بیٹا گو تم نے مجھ کو سلام نہیں کیا؟ لیکن ضرور

ہے کہ میں تم کو دعا دوں۔ ''جیتے رہو، عمر دراز، خدا نیک ہدایت دے''۔ اُن کا یہ کہنا تھا کہ میں غیرت کے
مارے زمین میں گڑ گیا اور فوراً میں نے اُٹھ کر نہایت ادب کے ساتھ سلام کیا۔ تب حضرت بی نے فرمایا
کہ یہ بات ہمارے یہاں بھلے مانسوں کا دستور ہے کہ اپنے سے جو بڑا ہوتا ہے اس کو سلام کر لیا کرتے ہیں اور
ہم تم کو نہ ٹوکتی لیکن چونکہ تم میرے بچوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہو اس سبب سے مجھ کو جتا دینا ضرور تھا۔
اس کے بعد حضرت بی نے مجھ کو مٹھائی دی اور بڑا اصرار کر کے کھلائی مدتوں میں ان کے گھر جاتا رہا۔
حضرت بی بھی مجھ کو اپنے نواسوں کی طرح چاہنے اور پیار کرنے لگیں اور ہمیشہ مجھ کو نصیحت کیا کرتی
تھیں۔ تبھی سے میرا دل تمام کھیل کی باتوں سے کھٹا ہو گیا۔ باپ ''یہ تو تم نے اچھا اختصار کیا۔ اجی سب
باتیں مجھ کو سناؤ! کیا کیا تم سے حضرت بی نے کہا'' ''بیٹا'' ہر روز آنے جانے سے میں اُن لوگوں کے ساتھ
خوب بے تکلف ہو گیا، مگر حضرت بی نے بس پہلے دن سلام نہ کرنے پر ٹوکا تھا پھر کوئی گرفت نہیں کی۔
باوجود یہ کہ میں شوخی بھی کرتا تھا لیکن وہ خبر نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن مجھ سے اور ایک ہمسایے کے لڑکے
سے باہر گلی میں کھیلتے کھیلتے عین اُنہیں کے دروازے سے پر لڑائی ہو پڑی۔ سخت کلامی کے بعد گالی گلوج
کی نوبت پہونچی، پھر مار کٹائی ہونے لگی، لڑکا مجھ سے تھا کمزور، اڑنگے پر چڑھا جو ایک پٹخنی دیتا ہوں،
چاروں شانے چت۔ پھر تو میں اُس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور بچہ کو ایسے گھسے دیے کہ یاد ہی کیے ہوں
گے، اور لوگ چھڑا نہ دیتے تو میں اس کو ادھ مرا کر ہی چکا تھا۔ بارے دو چار آدمیوں نے مجھ کو اُس پر سے
اُتارا اور دو ایک نے میری پیٹھ بھی ٹھوکی۔ شاباش پٹھے شاباش۔ لیکن وہ لڑکا ایسا چپند باز تھا کہ پھر خم ٹھوک
کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ پھر گتھ جاؤں اتنے میں اندر سے اُسے میرے ہم جماعت نے
آواز دی ادھر لوگوں نے کہا کہ میاں جانے بھی دو۔ یہ تمہارے جوڑ کا نہیں ہے، غرض میں اندر چلا گیا۔
میرے ہم جماعت نے پوچھا کیوں جی کس سے لڑ رہے تھے میں نے کہا۔ میاں یہی کنجڑے والا رمضانی،
کمزور مار کھانے کی نشانی، لیکن خدا کی قسم میں نے بھی آج اُس کو ایسا رگڑا ہے کہ یاد ہی تو کرے گا۔ اُس
وقت تک غصہ اور طیش تو فرو ہوا ہی نہ تھا۔ نہیں معلوم کیا کیا میں نے بکا کہ سب گھر والوں نے سنکر آنکھیں
نیچی کر لیں اور بڑی دیر تک سرنگوں بیٹھے رہے۔ آخر حضرت بی بولیں کہ سلیم بڑے افسوس کی بات ہے کہ تو

Scanned by CamScanner

ایسا پیارا لڑکا اور گُن تیرے ایسے خراب! اس مُنھ سے ایسی باتیں، آج کئی دن سے میں تجھ کو سمجھانے والی
تھی مگر اس وقت جو میں نے تیری گفتگو سنی مجھ کو یقین ہو گیا کہ تجھ کو سمجھانا بے سود ہے۔ بڑا رنج تو مجھ کو اِسی
بات کا ہے کہ تو ہاتھ سے گیا گزارا ہوا دوسرا کھٹکا یہ ہے کہ تو میرے لڑکوں کے پاس آتا جاتا ہے اگر
خدانخواستہ تیری خو بو کا ایک شمہ اُنہوں نے اختیار کیا تو میری طرف سے یہ جیتے جی مرے، ملنا جلنا تو بڑی
بات ہے اب یہ محلہ مجھ کو چھوڑنا پڑا اتنی بے حیائی ایسی بدزبانی اول تو لڑنا اور پھر گلی کوچے میں اور اس پر
ایسی موٹی موٹی گالیاں۔ میں ''جناب خدا کی قسم ہرگز میں نے پہل نہیں کی۔ وہ سر چڑھ کر مجھ سے لڑا''۔
حضرت بی ''بس اپنی قسموں کو بند کرو میں قسم اور گالی دونوں کو برابر سمجھتی ہوں۔ جس کو خدا کا نام لینے میں
باک نہیں اُس کو کسی بات کے بک دینے میں تامل نہیں''۔ میں ''گالی بھی پہلے اُس نے مجھ کو دی حضرت
بی''۔ تم نے کیوں گالی کھانے کی بات کی''۔ میں ''یہی تو میں عرض کرتا ہوں کہ میرا مطلق قصور نہ تھا''۔
حضرت بی ''کیا ایسے بیہودہ لڑکوں سے ملاقات رکھنا تمہارا قصور نہیں ہے'' میں ''جناب آپ کو معلوم نہیں
وہ لڑکا راہ چلتوں کے سر ہوتا ہے''۔ حضرت بی ''یک نشد دو شد دروغ گویم بر روئے تو۔ میرے لڑکوں
کے تو کوئی بھی سر نہیں ہوتا''۔ میں ''ان سے تو سرے سے جان پہچان ہی نہیں''۔ حضرت بی ''اور تم سے
ہے۔ میں یہ کیونکر کہوں کہ نہیں ہے''۔ حضرت بی ہے تو وہی تمہارا قصور ہے اور اِسی کی یہ سزا ہے کہ تم نے
بازار میں گالیاں کھائیں۔ میں ''لیکن میں نے بھی خوب بدلا لیا''۔ حضرت بی ''بس یہی تو تمہاری خرابی
کے لچھن ہیں کہ اس کو تم بدلا سمجھتے ہو، اگر ایک شخص تمہارے ساتھ کچھ برائی کرے تو اُس کو لوگ برا کہیں
گے'' میں ''ضرور کہیں گے'' حضرت بی ''اور جب تم اُس کے ساتھ زیادہ برائی کرو تو کیا تم زیادہ برے نہ
کہلاؤ گے۔ گالی بکنا ایک زبون بات ہے۔ اُس نے بکیں جھک مارا اور تم نے زیادہ بکیں تو زیادہ جھک
مارا۔ سلیم تم اپنی بستی اور اُس کنجڑے کے چھوکرے میں کچھ فرق سمجھتے ہو''۔ یہ سنکر مجھکو ندامت شروع ہوئی
اور میں نے کہا کہ واقعی میں اُس وقت تو مجھ میں اور اُس میں کچھ فرق نہ تھا حضرت بی ''لیکن وہ ایک
بازاری آدمی کا بیٹا ہے اور تم ایک بڑے عزت دار کے لڑکے ہو تمہارے دادا کا شہر میں وہ شہرہ ہے کہ ان
کے نام کی لوگ تعظیم کرتے ہیں، انہیں کے پوتے تم ہو جھوٹ بولنے پر، دلیر قسم کھانے میں بیباک، فحش

بکنے میں بے دھڑک۔ سلیم کوئی شخص دین اور دنیا دونوں میں اس وجہ سے عزت نہیں پا سکتا کہ اس کے باپ دادے عزت دار تھے۔ آدمی کی عزت اُس کی عادت اور مزاج سے ہے کیا تم کہہ سکتے ہو کہ یہ عادتیں جو تم نے سیکھی ہیں عزت حاصل کرنے کی ہیں۔ ہرگز نہیں"۔ یہ سن کر مجھ کو اس قدر شرمندگی ہوئی کہ میں رونے لگا اور حضرت بی بھی آبدیدہ ہوئیں اور مجھ کو پاس بٹھا کر پیار کیا اور کہا کہ بیٹا میں تمہارے ہی فائدے کے لیے کہتی ہوں اب بھی کچھ نہیں گیا لیکن چند روز بعد تم کو ان عادتوں کا چھوڑنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ میں نے اسی وقت توبہ کی اور کہا کہ اگر اب سے آپ مجھ کو قسم کھاتے یا فحش بکتے یا جھوٹ بولتے یا بازاری لڑکوں میں کھیلتے سنیں تو مجھ کو اپنے گھر نہ آنے دیجیے گا۔ باپ "کیا بس اُسی دن سے تم کو کھیلنے سے نفرت ہو گئی"۔ بیٹا "جناب نہیں مہینوں میں حضرت بی کے یہاں جاتا رہا اور ہر روز نصیحت کی دو چار باتیں وہ مجھ کو بتایا کرتی تھیں۔ ایک روز اُنہوں نے مجھی سے میرے وقت کا حساب پوچھا میں نے سونا اور کھانا اور کھیلنا اور تھوڑی دیر لکھنا پڑھنا بہتیرے کام گنوائے مگر انہوں نے سن کر ایک ایسی آہ کھینچی کہ آج تک اُس کی چوٹ میں اپنے دل میں پاتا ہوں اور کہا کہ سلیم آٹھ پہر میں خدا کا ایک کام بھی نہیں۔ خدا نے تم کو آدمی بنایا۔ کیا ممکن نہ تھا کہ وہ تم کو بلی یا کتا بنا دیتا۔ پھر آدمی بھی بنایا تو ایسے خاندان کا جو عزت دار اور خوشحال ہے۔ ہو سکتا تھا کہ تم مزدور یا لکڑہارے کے گھر پیدا ہوتے اور ایسی ہی چھوٹی سی عمر میں تم کو پیٹ پورا کرنے کے واسطے محنت کرنی پڑتی اور پھر بھی سوائے جینے کے اور کچھ بتاتے کھانا ملتا وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں۔ ایک لنگوٹی باندھے پھرتے۔ نہ پاؤں میں جوتی، نہ سر پر ٹوپی، نہ گلے میں انگرکھا، جہاں جاتے دور دور رکھا جاتا جس کے پاس کھڑے ہوتے پھٹ پھٹ۔ پھر صورت تم کو ایسی پاکیزہ دی کہ جو دیکھے پیار کرے کیا تم کو کالا بھٹ کا نڑا لنگڑا کوڑی بنا دینا اُس کو مشکل تھا۔ جس خدا کے تم پر اتنے سلوک اور اتنے احسان ہیں ستم ہے کہ دن رات میں ایک دفعہ بھی اُس کے آگے سر نہ جھکاؤ۔ غضب ہے کہ ایک لحہ بھی اُس کو یاد نہ کرو۔ تب حضرت بی نے مجھ کو نماز سکھائی اُس کے معنی سمجھائے اور اسی طرح انہوں نے مجھ کو ہزارہا نصیحتیں کیں کہ برزبان یاد نہیں رہیں مگر افسوس ہے کہ کئی مہینے سے ان کے گھر میرا جانا چھوٹ گیا۔ یہ کہکر سلیم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ✪✪

Scanned by CamScanner

اِنشائیہ

عربی لفظ انشا کے معنی عبارت لکھنا، طرزِ تحریر یا کوئی بات پیدا کرنا کے ہوتے ہیں۔ اردو میں اسی لفظ انشا سے انشائیہ کا وجود ہوا۔ انشائیہ اُردو نثر کی ایک غیر افسانوی صنف ہے۔ ایسے تمام مضامین جن میں خیالی یا انہونی باتوں کے بجائے زندگی، عمل اور تجربات کی باتیں بیان کی جائیں انہیں مضمون کے بجائے انشائیہ کہا جائے گا کسی سائنسی، ادبی، مذہبی غرض دنیا کے کسی بھی عنوان پر لکھی ہوئی تحریر مضمون کہلاتی ہے جبکہ انشائیہ کے دوران بیساختہ خیالات کو دلچسپ انداز میں بیان کر کے مضمون نگار اپنے دل کا غبار نکالتا ہے۔ انگریزی لفظ Light Essay یا Personal Essay کے متبادل کے طور پر اُردو میں انشائیہ کا لفظ رائج ہے۔ جس میں کسی منصوبہ بند طریقے با ضابطہ مواد یکجا کر کے اظہارِ خیال نہیں کیا جا سکتا بلکہ دل و دماغ پر اثر انداز ہونے والے خیالات کو عبارت کے ذریعے پیش کرنا ''انشائیہ'' کے ذیل میں آتا ہے۔ عام انداز میں بیساختہ اور لا ابالی تحریر کو ''انشائیہ'' کی صنف میں شمار کیا جائے گا۔ ✪✪

فنی جائزہ

ذہن کی آزاد ترنگ کو انشائیہ کہا جاتا ہے۔ ایک صنف کی حیثیت سے انشائیہ کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ اُردو کے ناقدین کسی ایک رائے پر متفق نہیں۔ نیاز فتح پوری نے Essay کے لیے طیفیہ کا لفظ وضع کیا اور پروفیسر سیدہ جعفر کے نزدیک مضمون ہی ایسے ہے جبکہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے اُردو میں ''ایسے'' کا متبادل نہ ہونے کی وجہ سے انگریزی لفظ کے استعمال پر زور دیا۔ نیاز فتح پوری کے نزدیک موثرات اور تاثرات کے باہمی ربط کو خیالات کی رو کے ساتھ پیش کرنا انشائیہ ہے۔ کسی خاص موضوع پر لکھنے والے کے خیالات اور جذبات کے ردِعمل کا پرتو ایسے کہلاتا ہے۔ جس میں بیک وقت فکر انگیزی، خیال کی رعنائی، تاثرات کی دلفریب ترجمانی، اسلوب کا نکھار اور تصور کی لطافت سب ہی عناصر

تاریخی پس منظر

اُردو میں انشائیہ کی روایت موجود نہیں تھی۔ سرسید نے لندن کا سفر کرنے کے دوران وہاں کے اخبارات سے ایک نئی صنف نثر کی بنیاد کے فروغ کو محسوس کیا۔ وہاں کے اخبارات اسپیکٹیٹر اور ٹٹلر میں شائع ہونے والے مقصدی مضامین سے سرسید احمد خان بیحد متاثر ہوئے اور اسی انداز کے مضامین سے یوروپی دنیا میں ادیبوں کی نمائندگی کو موثر سمجھا۔ چنانچہ اس قسم کے مضامین کو اُردو میں مقبولیت دلانے کی غرض سے اپنے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع کیے۔ جو انگریزی زبان سے استفادہ کے نتیجہ میں عالم وجود میں آئے تھے۔ اُردو میں انشائیہ نگاری کی بنیاد انگریزی زبان سے متعلم ہوئی۔ جسے سرسید احمد خان کی سرپرستی حاصل رہی۔

سرسید احمد خان کے رفقا نے انشائیہ Essay یا پھر Light Essay کے فروغ پر خصوصی توجہ دی حکیم خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی نے انشائیہ کی روایت کو مستحکم کیا۔ خواجہ

سموئے ہوئے ہوتے ہیں۔" ایسّے ہمارے ذہن کو ایک خاص ذوقِ آگاہی بخشتا ہے اور ہمارے جذبات میں انبساط پرور تازگی اور تابناکی پیدا کرتا ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر کے مطابق انشائیہ کی صنف میں بڑی لچک اور اس کے موضوعات میں بڑی ہمہ گیری ہے اور اس صنفِ ادب کے ذریعہ بہت سے کام لیے گئے ہیں۔ انشائیہ کے ذریعہ سماجی و ذہنی بیداری، اصلاحی و افادی مقاصد کی اشاعت اور انسانی جذبات کی حسین اور رنگین مرقع نگاری کی جاتی ہے۔ انشائیہ کے توسط سے مزاح اور ظرافت کی پھلجھڑیاں ہی نہیں چھوڑی جاتیں بلکہ طنز کے تیر بھی برسائے جاتے ہیں۔ غرض ایسے کی صنف کا مقصد ہی انسان کے جذبات، خیالات اور احساسات کی نمائندگی کرنا ہے۔ ڈاکٹر اطہر پرویز نے بتایا کہ ایسے کے لیے اُردو میں "مضمون" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مضمون کے زمرے میں مذہبی، سماجی، سیاسی مضامین سے لیکر علمی، ادبی سائنسی اور تحقیقی غرض ہر قسم کے مضامین آجاتے ہیں۔ انہیں ادبی مقام اس لیے نہیں دیا جاسکتا کہ وہ ادبی معیار کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے کیونکہ ان کے اندر مواد اور ان کی اپنی ہئیت ہوتی ہے۔ مضمون کی افادیت بھی مسلم ہے۔ جہاں سارا زور بات کو نمایاں کرنے کے انداز پر دیا جاتا ہے۔ جبکہ انشائیہ میں علم و حکمت کی باتیں ہوتی ہیں جس میں غور وفکر کا دامن ایک لمحہ کے لیے بھی چھوڑا نہیں جاتا۔ غرض سنجیدگی کے ساتھ مسائل کا بیان اور الجھنوں کو سلجھانے کے ساتھ ذاتی تجربات اور احساسات جس مضمون میں شامل ہوں گے۔ انہیں انشائیہ یا Essay کہا جاتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط "غبارِ خاطر" میں اس انداز کی کارفرمائی موجود ہے اسی لیے ان کے خطوط کو انشائیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

حسن نظامی کی انشائیوں میں فن اور اظہار کا تنوع موجود ہے۔ سلطان حیدر جوش اور سجاد حیدر یلدرم نے انشائیہ کو اس کی فنی خصوصیت کے ساتھ برقرار رکھا انشائیہ کی سنجیدگی اور اس کی روایت کی جانب نمائندگی کرتے ہوئے وزیر آغا نے لکھا ہے کہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ "لائٹ ایسّے" کے لیے انشائیہ کا لفظ مروج کیا گیا چونکہ اُردو میں انشائیہ کی کوئی خاص روایت موجود نہیں تھی اور قارئین نے ایسّے کو طنزیہ و مزاحیہ مضامین سے الگ اور جدا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس لیے جب ماہنامہ "ادب لطیف" میں لائٹ ایسّے کو پیش کرنے کی تحریک کا آغاز ہوا تو میرے اور میرزا ادیب کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ لائٹ ایسّے کو کیا نام دیا جائے تاکہ دوسری اصناف سے الگ نظر آسکے۔ کچھ عرصہ کے بعد ہم نے "لطیف پارہ کی ترکیب استعمال کی لیکن یہ مقبول نہ ہوسکی۔ پھر ہم نے "انشائے لطیف" کی ترکیب کا احیاء کیا لیکن معیت نہ تھی۔ اسی دوران میں نے کسی ادبی رسالے میں انشائیہ کا لفظ پڑھا۔ مرزا ادیب صاحب سے میں نے ان کا ذکر کیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ اس کے بعد کے "ادب لطیف" میں لائٹ ایسّے کے لیے انشائیہ کا لفظ ہی استعمال ہوتا رہا۔ غرض انشائیہ جیسی صنف اور اس کے تقاضوں پر اختلاف موجود ہے اور عرصہ دراز تک انشائیہ کے لیے خوش طبعی کو اہمیت نہیں دی گئی تھی لیکن رفتہ رفتہ طنزیہ و مزاحیہ نثر پاروں میں بھی انشائیہ کی بنیاد مستحکم ہونے لگی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، کشمیری لال ذاکر، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین اور دوسرے قلمکاروں نے طنزیہ و مزاحیہ انشائیے کی روایت پر توجہ دی۔ اس طرح اُردو میں رائج انشائیہ کا لفظ جہاں سنجیدہ افکار کے اظہار کا ذریعہ بنا وہیں مزاحیہ تحریروں کے وسیلہ کے طور پر بھی استعمال ہونے لگا۔ اس طرح ایسّے اور لائٹ ایسّے کی انگریزی لفظیات کا پرتو اُردو نثر میں دکھائی دیتا ہے۔ غرض سرسید کے دور سے لے کر آج کے دور تک زائد از سو سال پر محیط اُردو انشائیہ کی تاریخ اُس کی سنجیدگی اور مزاح نگاری کی نمائندگی کرتی ہے۔

Scanned by CamScanner

انشائیہ

ذوقِ چائے نوشی

از:۔ مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء......۱۹۵۸ء) اصل نام محی الدین احمد تھا۔ مکہ کی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کے مریدین کی کثیر تعداد تھی۔ مکہ سے لوٹے تو والد کے ساتھ کلکتہ میں قیام کیا۔ ایک ممتاز عالم دین، مفسر قرآن، بے باک صحافی، عظیم سیاسی لیڈر اور ممتاز خطیب کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ جدوجہد آزادی کے دوران عملی سیاست میں حصہ لیا اور جیل کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی حمایت کی۔ اخبار ''البلاغ'' اور ''الہلال'' کے مدیر رہے۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز اخبار ''الہلال'' کی تحریروں سے ہوا۔ وطن کی آزادی کے لیے انگریزوں کے خلاف صحافت کے ذریعے جنگ لڑی۔ انگریزوں نے جیل بھیج کر ان کے اخبار کو بند کر دیا۔ ان کی صحافت، خطابت اور ادبی تحریروں میں دانشورانہ اور مفکرانہ حیثیت تسلیم شدہ ہے۔ وہ اُردو کے صاحبِ طرز انشا پرداز تھے۔ ان کی تحریر میں عربی تراکیب اور فارسی طرز انداز کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ مشکل پسندی ان کی نثر کی خصوصیت ہے ابتداء میں شاعری بھی کی لیکن بعد میں ترک کر دیا۔ منطقی اور فلسفیانہ انداز میں اظہار ان کی تحریر کی خصوصیت ہے۔ اگرچہ انہوں نے بے شمار مذہبی، ادبی اور فلسفیانہ کتب اور مضامین لکھے لیکن احمد نگر جیل میں قید کے دوران اپنے دوست حبیب الرحمٰن شیروانی کو انہوں نے جو خطوط لکھے انہیں ''غبارِ خاطر'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ یہ خطوط ''انشا پردازی'' کے بہترین نمونے ہیں اور انہیں ادب کے شاہکار کا درجہ حاصل ہے چنانچہ ''غبارِ خاطر'' سے منتخب ایک خط کا متن ''ذوقِ چائے نوشی'' کے زیرِ عنوان پیش کیا جا رہا ہے۔ جس میں انہوں نے انشائیہ کی ضرورت یعنی ''ذہن کی آزاد ترنگ'' کا استعمال کیا ہے۔ اسی لیے یہ ''انشائیہ'' ایک مثال کے بطور نصاب میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ✪✪

آپ کو معلوم ہے میں ہمیشہ صبح تین سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پے بہ پے فنجانوں سے جامِ صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں۔

Scanned by CamScanner

یہ وقت ہمیشہ میرے اوقاتِ زندگی کا سب سے زیادہ پر کیف وقت ہوتا ہے لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اس امر کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا۔ جو اس وقت خواب آلود آنکھیں لیے ہوئے اٹھے اور قرینہ سے چائے بنا کر میرے سامنے دھرے۔ اس لیے خود اپنے ہی دستِ شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس وقت بادۂ کہن کے شیشہ کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبہ کھولتا ہوں اور ایک ماہرِ فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں، پھر جام و صراحی کو میز پر دہنی طرف جگہ دوں گا کہ اس کی اولیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سرد سامانِ کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور کچھ نہ پوچھیے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا؟ کسی بادہ گسار نے شامپین اور بورڈ کے صد سالہ تہہ خانوں کے عرقِ کہن سال میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہوگا جو چائے کہ اس دورِ صبح گاہی کا ہر گھونٹ میرے لیے مہیا کر دیتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے کے لیے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں یہ چائے کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوقی کے ساتھ پیجیئے تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائیں مگر خدانخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا؟ میں جرعہ کشانِ کہن مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا، اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لونگا پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائے گا تو کچھ دیر کے لیے رک جاؤں گا اور اس درمیانی وقفہ کو امتدادِ کیف کے لیے جتنا طول دے سکتا ہوں طول دونگا پھر دوسرے اور تیسرے کے لیے ہاتھ بڑھاؤں گا اور دنیا کو اور اس کے سارے کارخانۂ سود و زیاں کو یک قلم فراموش کر دوں گا۔

اس وقت بھی کہ یہ سطریں بے اختیار نوکِ قلم سے نکل رہی ہیں، اُسی عالم میں ہوں اور نہیں جانتا کہ ۹/ اگست کی صبح کے بعد سے دنیا کا کیا حال ہوا اور اب کیا ہو رہا ہے۔

میرا دوسرا پر کیف وقت دوپہر کا ہوتا ہے یا زیادہ صحتِ تعین کے ساتھ کہوں کہ زوال کا ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتا ہوں، پھر اٹھتا ہوں، غسل کرتا ہوں

Scanned by CamScanner

چائے کا دور تازہ کرتا ہوں اور تازہ دم ہو کر پھر اپنی مشغولتیوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ اُس وقت آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سُورج کی بے نقاب درخشندگی کا جی بھر کے نظارہ کروں گا اور رواقِ دل کا ایک ایک دریچہ کھول دوں گا۔ گوشہ ہائے خاطر افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلود ہوں لیکن آسمان کی کشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں کہ اچانک روشن نہ ہو جائیں۔ لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مر جائے اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہیے۔ جس نے یہ مشکل حل کر لی اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا۔

غالباً قدیم چینیوں نے زندگی کے مسئلہ کو دوسری قوموں سے بہتر سمجھا تھا ایک پرانے چینی مقولہ میں سوال کیا گیا ہے "سب سے زیادہ دانش مند آدمی کون ہے" پھر جواب دیا ہے "جو سب سے زیادہ خوش رہتا ہے" اس سے ہم چینی فلسفہ زندگی کا زاویہ نگاہ معلوم کر لے سکتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ بالکل سچ ہے۔

اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے تو یقین کیجئے زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا اب اس کے بعد اس سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہیے اور دوسروں سے بھی کہیے کہ خوش رہیے کہ اپنے چہروں کو غمگین نہ بنائیں۔ زمانہ حال کے ایک فرانسیسی اہل قلم آندری ژید (Andri Gide) کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی جو اس نے اپنی خود نوشتہ سوانح میں لکھی ہے خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے یعنی ہماری انفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا وہ دوسروں تک بھی متعدی ہوتا ہے یا یوں کہئے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے اس لے ہمارا اخلاقی فرض ہوا کہ خود افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں۔

Scanned by CamScanner

ہمارے زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بیک وقت سینکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے اگر ایک چہرے پر بھی غبار آجائے گا تو سینکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے وہ پورے مجموعہ کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اٹھتی ہے لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوئی۔ ہم کچھ اپنے لئے کرتے ہیں اس میں بھی دوسروں کا حصہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی، اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکھٹے ہو جائیں گے۔ ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں۔ یہی حقیقت ہے جسے عرفیؔ نے اپنے شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا تھا۔ ✪✪

Scanned by CamScanner

خطوط

خطوط نویسی یا مکتوب نگاری قدیم دور سے اظہار کی خصوصیت رہی ہے۔ انگریزی میں عام طور پر Letter Writing اور خصوصی گرجا کے پادریوں کے درمیان ہونے والی مکتوب نگاری کو Epistle کہا جاتا ہے۔ اُردو میں خطوط نگاری فارسی زبان کے زیر اثر پروان چڑھی۔ فارسی کے ادیبوں اور شاعروں نے عربی انشا کے اساس پر اپنی زبان میں خطوط نویسی کو فروغ دیا۔ عام نثری اصناف کی طرح اُردو میں خطوط نویسی انگریزی ادبیات کے زیر اثر پروان نہیں چڑھی بلکہ فارسی زبان کے زیر اثر اُردو میں خطوط نویسی کا رواج ہوا۔ کاتب یعنی خط لکھنے والے اور مکتوب الیہ یعنی جس کو خط لکھا جائے، ان دونوں کے آپسی تعلقات اور راز و نیاز کو جس تحریر میں نمایاں کیا جائے اسے ''خطوط'' کہتے ہیں اور خطوط میں دو شخصیتوں کے درمیان موجود تعلقات اور حالات سے واقفیت ممکن ہے۔ ✪✪

مکتوب نگاری کا فن

کاتب اور مکتوب الیہ کے تعلقات کا اظہار جس تحریر میں ہوگا۔ اسے خطوط نگاری کہا جاتا ہے۔ ایک خط لکھنے کے لیے حسب ذیل چیزوں پر توجہ ضروری ہے۔ ۱۔ سرنامہ ۲۔ القاب ۳۔ متن ۴۔ تعلقات کا ذکر ۵۔ اختتامی کلمات ۶۔ معجز بیانی ۷۔ مکتوب الیہ کا پتہ۔

خط کی پیشانی پر تاریخ۔ مقام، کاتب کا پتہ اور نام تحریر کرنا ''سرنامہ'' کہلاتا ہے جس کے بعد مکتوب الیہ کی عمر، شخصیت، عہدہ اور رشتہ کی مناسبت سے مخاطب کرنے کو ''القاب'' کہا جائے گا۔ جس کے بعد نیک توقعات کا اظہار ''متن'' کا درجہ رکھتا ہے۔ اپنے حالات اور مکتوب الیہ سے روابط کے ساتھ موسم، ماحول اور رویوں کا ذکر کرنا ''تعلقات کا ذکر'' کہلاتا ہے جب کہ خط کو اختتامی مرحلہ پر لانا ''اختتامی کلمات'' کہلائے گا اور پھر اپنی انکساری ظاہر کرتے ہوئے نام لکھنا یا دستخط کرنا ''معجز بیانی''

تاریخی جائزہ

اُردو میں نثری صنف کی حیثیت سے خطوط نگاری کا آغاز مرزا غالب کی تحریروں سے ہوا۔ مولانا حالی نے اپنے استاد مرزا غالب کی سوانح لکھنے کے دوران لکھا ہے کہ غالب نے ۱۸۵۰ء کے دوران اُردو میں خطوط لکھنے کی بنیاد رکھی جبکہ خطوطِ غالب میں ۱۸۴۶ء کے تحریر کردہ چار خطوط موجود ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو میں خطوط نگاری کا آغاز غالب کے خطوط کی وجہ سے ۱۸۴۶ء میں ہوا۔ مرزا غالب کے خطوط کے دو مجموعے ''اُردوئے معلیٰ'' اور ''عود ہندی'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ مختصر القاب کے ساتھ غالب نے بیساختہ خطوط لکھے جنہیں اُردو کے مایہ ناز خطوط میں شمار کیا جاتا ہے۔ غالب نے خود اپنے خطوط میں لکھا ہے کہ ''میں نے وہ طرز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مکاتبہ کو مکالمہ بنادیا۔ ہزاروں میل دور رہا کرو اور وصل کے مزے لیا کرو''۔ غالب کے خطوط میں سادگی اور بیساختہ پن کی وجہ سے ان کی اہمیت سے انکار

کی دلیل ہے اور سب سے آخر میں اگر مکتوب الیہ کا نام اور پتہ خط پر نہ لکھا جائے تو خط لکھنے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اس طرح ایک خط لکھنے کے لیے ان تمام خصوصیات پر نظر رکھنا ضروری ہے۔

اُردو میں خطوط نگاری کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ یہ طریقے خط کے موضوع کے اعتبار سے عنوان کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں چنانچہ خطوط کو حسب ذیل اقسام میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ عشقیہ خطوط ۲۔ خانگی خطوط ۳۔ کاروباری خطوط ۴۔ دوستانہ خطوط ۵۔ درخواست۔

مرد و خواتین کے تعلقات کو جن خطوط میں ظاہر کیا جائے گا انہیں عشقیہ خطوط کی فہرست میں شامل کیا جائے گا۔ رشتہ داری اور خاندان کے تعلقات کو بنیاد بنا کر لکھے جانے والی تحریریں خطوط خانگی خطوط کہلاتی ہیں۔ تجارت، خریدی یا پھر کسی چیز کی طلب کے لیے لکھے جانے والے خطوط کو ''کاروباری خطوط کا درجہ حاصل ہے۔ دوست احباب اور ہم عمر ایک دوسرے سے رابطہ کو استوار رکھنے کے لیے جس قسم کے خطوط لکھتے ہیں انہیں دوستانہ خطوط کا درجہ حاصل ہے۔ رخصت، ملازمت، بیماری، داخلہ یا پھر علاحدگی کے موقع پر لکھے جانے والے خطوط کو ''درخواست'' کہا جاتا ہے۔ اس طرح مکتوب نگاری کے مختلف انداز اُردو میں موجود ہیں۔ دور حاضر میں کاروباری خطوط کو اہمیت حاصل ہے اور کاروباری خطوط لکھنے کی مشق کے لیے ایک پورا مضمون Secretarial Practice پڑھایا جاتا ہے۔ غرض اُردو میں خطوط نویسی کا فن مستحکم نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری میں غالب جس قدر مشکل پسند ہیں وہ اپنے خطوط میں اسی قدر آسان پسند نظر آتے ہیں۔ غالب کے بعد اُردو کے بیشتر شاعر اور ادیب کے خطوط اشاعت پذیر ہونے لگے۔ سرسید اور ان کے نامور رفقا کے خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ چونکہ خطوط آپسی تعلقات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس لیے خطوط کے مواد سے زیادہ اسلوب کی اہمیت ہوتی ہے۔ خیالات کی پیشکشی میں روانی اور تسلسل کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی چاشنی برقرار رہے تو ایسے خطوط اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ اُردو میں ادبی، مذہبی، سیاسی اور سماجی شخصیتوں کے خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ سرسید احمد خان کے خطوط کو اُردو نثر میں اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ ایک مصلح کی حیثیت سے انہوں نے احباب کو خطوط لکھے۔ ان کی شخصیت کا پرتو اُن کے خطوط میں دکھائی دیتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کے خطوط میں ان کے تاریخی شعور کا وجدان محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مولانا حالی کے خطوط میں اصلاحی رجحان کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ سید سلیمان ندوی کے خطوط میں مذہب اور شرعی مسائل کا پرتو موجود ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط ''غبار خاطر'' میں انشا پردازانہ اسلوب جھلکتا ہے۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور علامہ اقبال کے خطوط میں قومیت اور حریت کے عناصر کارفرما نظر آتے ہیں۔ اُردو میں منظوم خطوط کے علاوہ خواتین کے خطوط بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ خواتین کے خطوط میں نسائی حسیت کا پرتو دکھائی دیتا ہے ''غبار خاطر'' کی انشا پردازی کے مقابل صفیہ اختر کے ''زیرِ لب'' کے خطوط ایک فراق زدہ شوہر پرست خاتون کے جذبات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

خطوط

مکتوبات صفیہ

صفیہ اختر

صفیہ اختر (وفات بمقام لکھنو ۱۷/ جنوری ۱۹۵۳ء) مجاز لکھنوی کی بہن اور جاں نثار اختر کی شریک حیات کی حیثیت سے صفیہ اختر شہرت رکھتی تھیں۔ علی گڈھ سے اُردو میں ایم۔ اے کرنے کے بعد جاں نثار اختر سے شادی ہوئی اور ان کے ساتھ زندگی گذارنے کے لیے بھوپال چلی آئیں۔ جہاں جاں نثار اختر حمیدیہ کالج بھوپال میں لکچرر کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے تھے۔ ملازمت کی خاطر اور ترقی کے لیے جاں نثار اختر نے ممبئی کا رخ کیا اور صفیہ اکیلی ہو گئیں۔ اسی دوران انہوں نے اپنے شوہر کو مخاطب کر کے جو خطوط لکھے انہیں ''زیرلب'' کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ صفیہ اختر اپنے شوہر کے ہم خیال اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہیں۔ جس کے ساتھ ہی ان کی فطرت میں مشرقی تہذیب کی دلدادہ ہندوستانی عورت کے حجابات کا پرتو بھی دکھائی دیتا ہے۔ ''زیرلب'' ان کی زندگی کی دلکش داستاں ہے جس میں کرب و اضطراب اور شوہر سے قربت کی کسک محسوس کی جاسکتی ہے۔ صفیہ اختر بیماری میں مبتلا ہوئیں اور جاں نثار اختر کی حیات میں انتقال کر گئیں۔ ان کی رحلت پر جاں نثار اختر کی دلدوز نظم بھی موجود ہے صفیہ اختر کے خطوط میں مشرقی نسائی حسیت کا بھرپور پرتو موجود ہے۔ اس لیے ان کے خطوط کے مجموعہ ''زیرلب''، ''حرف آشنا'' اور ''اندازِ نظر'' شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ایک عورت کی حسیاتی کیفیت جلوہ گر ہے۔ ✪✪

مسلم گرلز کالج

علی گڑھ

۱۴/ جنوری ۴۴ء

عزیز اختر

خوش رہو، مسکراتے رہو

Scanned by CamScanner

خیر یت لکھوں؟ یا یہ کہوں کہ ''علم بھی ہے عمل بھی ہے غم بھی'' بہر کیف زندگی کو راہ پر لانے کی کوشش میں انتشار ضروری ہے اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس طرف خیریت ہے اور چنبل کے اُس پار کی خیریت معلوم کرنے کی بے چینی۔ نہ معلوم جذبات کے کس دور سے گذر رہے ہو؟ زندگی کتنی سونی ہے اور کتنی آباد۔ یہاں اگر تمہاری عدم موجودگی سے ایک بھیانک ویرانی کا احساس ہے تو ساتھ ہی ساتھ تمہارے تصور نے دل کے نگارخانے کا گوشہ گوشہ جگمگا رکھا ہے۔ یہ احساس بھی میرے لیے عجیب ندرت رکھتا ہے۔ پھر یہ دو دن مسلسل اسی بہلاوے میں گذارے ہیں کہ ملوں گی اور بہت جلد ملوں گی۔

کل سے موسم بڑا پر کیف ہو گیا ہے، آسمان پر ابر منڈلا رہا ہے، ہلکی ہلکی گڑگڑاہٹ بھی ہو جاتی ہے۔ وقت کے گذرنے کا احساس مدھم سا ہو گیا ہے یہ اور بھی تکلیف دہ پہلو ہے، یہاں جی چاہتا ہے کہ ہر دن دو تاریخیں نکل جایا کریں!

دن بھر کالج کی لڑکیاں اور استانیاں ہلّہ بولتی رہتی ہیں اور اس توقع آمیز نگاہ سے مجھے دیکھتی ہیں، گویا مجھ میں کچھ موتی ٹکے ہوئے نظر آ ہی جائیں گے، پھر میری لاپرواہی اور بدپوشا کی کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ ضرور کہہ دیتی ہیں کہ Fresh ہوگئی ہو گو یہ بھی غلط ہی ہوتا ہے کیونکہ ستم ظریفی یہ کہ ''تازہ'' کے بجائے ''باسی'' ہو چکی ہوں! گواہی دینے پر تیار ہو گے یا نہیں۔

اس وقت سلمٰی اور سعیدہ کراماً کاتبین بنی ہوئی میرے دائیں بائیں بیٹھی ہوئی ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ لکھتے ہیں اور یہ پڑھ رہی ہیں۔ البتہ بیچ بیچ میں طرح طرح کے اشاروں کنایوں سے مجھے اپنی طرف موہ لیتی ہیں اور پھر یہ خط تنہا رہ جاتا ہے۔

تم خط لکھو گے؟ یا لکھ چکے ہو؟ مشاعرہ کیسا گزرا۔ پرسوں یہاں بھی کچھ از قسم مشاعرہ ہونے والا ہے، شاید اسرار بھائی آئیں۔ اگر نہ آئے تو کسی مہلت میں چند گھنٹوں کے لیے ملنے جاؤں گی، کیا ہے مرضی سرکار کی؟

اب تک خط نہ لکھا تو اب لکھو اور بتاؤ کہ کیسے رہتے ہو اور کیا کرتے ہو۔ ہر لحظہ تمہارا خیال آتا ہے اور اپنی طرف سے زندگی کی کسی اہم یا غیر اہم مصروفیت کے سلسلہ میں آتا ہے، معلوم نہیں اپنے اندازے میں کہاں تک درست ہوتی ہوں اور کس قدر غلط۔

Scanned by CamScanner

کالج کی مصروفیت آج سے شروع ہوگی۔ بیس تک ششماہی امتحانات اور اُس کے بعد Criticism کے اسباق ہیں اپنا پروگرام تمہاری مرضی سے بناؤں گی۔ بسنت کی چھٹیاں کب ہونگی؟ بجنور جاؤ گے یا نہیں؟ میری صلاح کی ضرورت محسوس کرو تو تکلف نہ کرنا، دوستی کا رشتہ ہمیشہ مضبوط تر ہونا چاہئے، یہی میری خواہش ہے۔

کب ملیں گے ہم لوگ؟ سچ لکھو

تصویروں کی فرمائش ضرور پوری کروں گی گو کہ اُن سے تمہارے مذاقِ لطیف کو صدمہ پہونچنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ بہرحال قصور میرا نہیں تمہاری نظرِ انتخاب کا ہے، لہٰذا غصّہ کرو تو اسی پر کرنا۔

سگریٹ کو میری رقابت پر مبارکباد کہنا۔ بتاؤ کہ زندگی کے کن کن لمحوں میں میرے بجائے وہ تمہاری ساتھی بنی رہتی ہے؟ اس کمبخت نے ہماری خلوتوں ہی میں کب ساتھ چھوڑا۔ زندگی کا دستور کیا ہے؟ میرا کمرہ کیا کہتا ہے؟ سب کو پیار، گھر کو بھی اور اس کی ''مبہم گلیوں'' کو بھی۔

تمہاری صفو

✪✪✪

میرے اپنے اختر

تمہارا خط کل ملا۔

خیریت سنی۔ شکر کہ اب اچھے ہو۔ خدا کرے بقیہ تکلیف بھی چلی گئی ہو۔

آج ایوب کا انتظار تھا۔ نہیں آئے۔ کیا بات ہوگئی؟ ایوب سے ملکر ایک خاص قسم کی تسکین ہوتی کیونکہ وہ تمہارے پاس سے آئیگا۔ بہرحال۔

کل شام کا ایک لمحہ میرے لیے اہم تھا۔ یہی چار اپریل کی شام تھی۔ جب تم نے پہلی مرتبہ مجھے آواز دی تھی اور میں نے اس کا خیر مقدم کس قدر گرم دل سے کیا تھا۔ پانچ سال گذر گئے۔ پوری تصویر نظروں میں گھوما کی وہ جگہ جہاں تم آ کر بیٹھے تھے، تمہارا انداز، تمہاری پوشاک، تمہاری گفتگو۔

Scanned by CamScanner

اپنے احساسات، ایک غیر شعوری سی مسرت اور ایک پنہاں سا جھکاؤ۔ کتنی معصوم شام تھی۔ کتنی بے خبر! نتیجے سے نا آشنا۔ آج میں صرف تمہاری ہی طرف توقع کی نظر سے دیکھتی اور دیکھ سکتی ہوں۔ آج میں تمہارے جگر گوشوں کو اپنے خون سے پرورش کر رہی ہوں، آج میری عزت سے تمہاری عزت اور میری بے وقعتی میں تمہاری ذلت ہے۔ اُس شام کیسے ہنستے مُسکراتے ہوئے دو چار منٹ کو مل بیٹھے تھے۔ اُس کے بعد تم نے اپنا راستہ لیا اور میں اپنے ٹھکانے پر رہ گئی۔ کسی کو کسی سے شکایت نہ تھی۔ آج تم میری سرپرستی میں خفیف سی کوتاہی بھی کرو تو میرا دل لے لگے۔ اور اگر میرے دل میں تمہاری گنجائش ذرّہ برابر بھی کم ہو تو تم مجھے ختم کر دینا بہتر سمجھو گے۔

زندہ ہوں اور پڑھائی میں مصروف، لکھنو جانے کی نیت برابر کر رہی ہوں، مگر کتابوں کا مسئلہ خاصا ٹیڑھا نظر آ رہا ہے۔ یہاں تو میاں کی مدد سے کچھ چیزیں مل رہی ہیں۔ وہاں سارے راستے مسدود ہونگے۔ پھر مشورہ بھی نہ مل سکے گا۔ لیکن جادو کی خدمت کا مسئلہ۔ لوگوں کی وجہ سے گھر میں بے آرامی یہ دونوں چیزیں بہت ہی پریشان کر رہی ہیں۔ عقل کام نہیں کرتی کہ کس طرح سونچوں۔

حل تو یہی ہے کہ لکھنو چلا جایا جائے۔ مگر پڑھائی؟ دیکھتی ہوں کیا کیا کتابیں بھیجتے ہو۔ اگر اطرف آٹھ دس دن میں کچھ معقول پڑھائی ہو گئی۔ تو بھاگ نکلوں گی۔

اختر کچھ جانتے ہو کتنی بے آرام اور بد مزہ زندگی گذار رہی ہوں؟ میں آئندہ سال اس گاڑی کو قطعی نہ گھسیٹ سکوں گی، ڈھائی سال میں نے تمہیں اپنی فکروں سے بچایا مگر اب بات میرے بس کی نہیں۔ اب تمہیں مجھ کو اپنے سائے میں لینا ہی پڑیگا۔ سمجھے؟ تمہیں میری ضرورت نہ بھی ہو تو مجھے تو تمہاری ضرورت ہے۔ کیا یہ کافی نہیں؟ بولو؟؟۔

خط لکھو؟ اپنا حال لکھو۔ مجھے محسوس ہونے تو دو تم سے دور رہ کر بھی تم سے پاس ہوں۔
میرا دم اُلجھنے سا لگتا ہے۔ بعض بعض وقت۔

تمہاری صفو

Scanned by CamScanner

مضمون

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لفظ مضمون عربی زبان سے اُردو میں مروج ہوا۔ دنیا کے کسی بھی عنوان پر لکھی ہوئی ایسی تحریر جس کے مطالعہ کی تکمیل ایک نشست یعنی ۱۵ تا ۲۰ منٹ کے اندر ہو جائے اسے مضمون کہتے ہیں۔ اس وقفہ سے زیادہ وقت مطالعہ کے لیے صرف ہو تو ایسی تحریروں کو طویل مضمون کہا جاتا ہے۔ دورِ حاضر میں اخبارات، رسائل اور جرائد میں طویل اور مختصر مضامین لکھنے کی روایت عام ہے۔ سماجی، سیاسی، مذہبی، سائنسی، اقتصادی، علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی موضوعات پر مضامین لکھے جاتے ہیں۔ ہر علم اور فن پر ایک نشست میں مطالعہ کے لیے لکھی جانے والی تحریر "مضمون" کہلاتی ہے۔ دورِ حاضر میں کھیل کود، تفریحات، فلم اور ٹی۔وی، آرائش و زیبائش، کمپیوٹر، وٹرنری، طب، قانون غرض ہر موضوع پر مضامین لکھنے کی روایت مستحکم ہو چکی ہے۔ لفظ مضمون عربی زبان کے کس لفظ سے مشتق ہے۔ اس کا اظہار اُردو کے ناقدین نے نہیں کیا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عربی لفظ ضمن بمعنی ذیلی یا تحت سے مضمون کا لفظ مروج ہوا۔ جس میں کسی بھی عنوان کے تحت آنے والے مختلف قسم کے مواد کو یکجا کیا جاتا ہے۔ اس طرح "مضمون" کو ایک صنف نثر کا درجہ حاصل ہے۔ ✪✪

مضمون کا فن

نثر میں لکھنے کا ایسا انداز جس میں ربط و تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے کسی عنوان کا تعین کر کے تمہید باندھی جائے اور عنوان سے متعلق درکار مواد فراہم کیا جا کر متن کی تفسیر کی جائے اور آخر میں دلچسپ انداز سے مضمون کا اختتام عمل میں آئے تو اس طریقہ کو مضمون کا فن قرار دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے کسی بھی مضمون کی تحریر کے لیے حسب ذیل طریقوں کو استعمال کرنا ضروری ہے۔

۱۔ تمہید ۲۔ مواد ۳۔ تفسیر متن ۴۔ اختتام

تمہید درحقیقت مضمون کا ابتدائی مرحلہ ہے جس کے ذریعہ مضمون کو شروع کرنے کے لیے سماں باندھا جاتا ہے۔ اس موقع پر کسی مفکر کے قول، کوئی ضرب المثل یا دنیا کی کسی اٹل حقیقت کے

تاریخی پس منظر

اُردو نثر کے ایک پُر زور ذریعۂ اظہار کی حیثیت سے "مضمون نگاری" کو اہمیت حاصل ہے۔ مضمون کا دائرہ کار عنوان پر منحصر ہے۔ اس لیے سارے علوم و فنون، صنعت و حرفت اور علمی و ادبی موضوعات کی تکمیل "مضمون" کے ذریعہ ممکن ہے۔ اُردو زبان میں دلی کالج کے استاد ماسٹر رامچندر کی تحریروں سے "مضمون نگاری" کی ابتدا ہوئی۔ ان سے قبل محمد غوث بے خبر کی کتاب "انشائے بہار بے خزاں" کے ذریعہ رنگین بیانی، ادب لطیف اور انشاء پردازی کے نمونے دستیاب ہیں۔ اُردو میں فطری اور بنیادی طور پر مضمون نگاری کا آغاز ماسٹر رامچندر کے مضامین سے ہوا۔ انہوں نے علوم و فنون سماج، معاشرت اور اقتصادی موضوعات پر مضامین لکھ کر شہرت حاصل کی۔ دلی کالج سے وابستہ مزید ایک ادیب ماسٹر پیارے لال کی تحریروں کو بھی مضمون کی سرشت میں

Scanned by CamScanner

اظہار کے ذریعہ موضوع مضمون کی جانب اشارہ و کنایہ میں توجہ دلانا کسی بھی مضمون کی تمہید کہلاتی ہے۔ مضمون نگاری کا یہ بنیادی وصف ہے جس سے مضمون کا آغاز ہوتا ہے۔ مضمون کی شروعات کے بعد جس عنوان اور موضوع کو نشانہ بنایا گیا ہے اس سے متعلق لازمی اور درکار معلومات کا فراہم کرنا "مواد یا متن" کا درجہ رکھتا۔ مضمون کا موضوع جو ہوگا۔ اسی کی مناسبت سے مواد کی فراہمی ضروری ہے۔ سائنسی، قانونی، تکنیکی، طبی، منصوبہ جاتی عنوانات پر مضمون لکھنے کے لیے مواد یا Data کی فراہمی ضروری ہے۔ علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین لکھنے کے لیے کتاب کی دستیابی اور اس کا تجزیہ ہی مواد کا درجہ رکھتا ہے۔ حاصل شدہ متن کی وضاحت اور اس کے محاسن یا معائب کا ذکر اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا "تفسیر متن" کہلاتا ہے۔ جس کے ذریعہ مواد کو پھیلانے اور اس پر اظہار خیال کرنے کے امکانات "تفسیر متن" میں موجود ہیں مضمون کو کسی ایک ڈگر پر لاکر اسے انجام کی طرف لے جانا "اختتام" کہلاتا ہے۔ درحقیقت قاری کو بھرپور مواد و فراہم کرنے کے بعد تحریر کو ایسے انداز سے وابستہ کیا جائے کہ جس کی وجہ سے مضمون ختم ہونے کا تاثر ابھرے اسے "اختتام" کہا جاتا ہے۔

پروفیسر سیدہ جعفر نے "اُردو میں مضمون نگاری" کتاب میں مضمون کی دس قسمیں بتائی ہیں۔ ۱۔ لیے ۲۔ مضمون نما تحریریں ۳۔ تاریخی مضامین ۴۔ سیاسی مضامین ۵۔ انشائے لطیف ۶۔ مذہبی مضامین ۷۔ سماجی اور اصلاحی مضامین ۸۔ فلسفیانہ مضامین ۹۔ طنز و مزاح ۱۰۔ تنقیدی و تحقیقی مضامین۔ ان کے علاوہ موضوع کے اعتبار سے مضامین کی مزید قسمیں بھی ثابت کی جاسکتی ہیں۔

شامل کیا جاتا ہے۔ اسی کالج کے طلبہ میں شمس العلماء ذکا اللہ، ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد شامل تھے۔ جن کی تحریروں میں بھی "مضمون نگاری" کا وصف کارفرما نظر آتا ہے۔

آزادی کی جدوجہد کے دوران اُردو رسائل و جرائد میں حریت پسند اور انقلابی عنوان پر مضامین لکھے گئے جس کی وجہ سے سنجیدہ مضامین کے بعد صحافتی مضامین کا دور دورہ رہا۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے قلمکاروں نے صحافتی مضامین کی بنیاد رکھی۔ اودھ پنچ سے وابستہ قلمکاروں نے "طنزیہ و مزاحیہ" مضمون نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ دلی کالج کے قیام ۱۸۲۴ء کے بعد علمی، اقتصادی اور سماجی مضامین کا چلن عام رہا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سرسید اور ان کے رفقاء نے مضمون کی ایک نئی نہج "انشائیہ" کو فروغ دیا۔ انشائیہ ایک الگ صنف نثر ہے لیکن اس کا شمار بھی مضمون میں کیا جاتا ہے۔ اُردو مضمون نگاری کا قافلہ دلی کالج سے رواں دواں ہوکر سنجیدہ مضمون کی روایت کی بنیاد رکھتا ہے جس کے بعد انشائیہ اور صحافتی مضامین کا دور دورہ رہا۔ ادب لطیف اور انشاپردازی کے علاوہ حسن کاری سے وابستہ مضمون نگاری کا بھی خصوصی دور رہا۔ جس میں رومانی اور جمالیاتی احساسات کو شامل کیا گیا۔ رسالہ "دلگداز" کے ذریعہ عبدالحلیم شرر لکھنوی، رسالہ "نگار" کے ذریعے نیاز فتح پوری۔ لطیف احمد اکبرآبادی۔ مہدی افادی نے ادب لطیف کو مضمون نگاری میں شامل کیا۔ اسی دوران تاریخ نویس افراد کے گروہ نے "تاریخی مضامین" کی شروعات کی مذہبی اور تاریخی مضامین کا ثبوت "مضامین شبلی" سے فراہم ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولوی عنایت اللہ دہلوی کی تحریروں میں تاریخ اور مذہب کا انداز نمایاں ہے۔ غرض اُردو میں مضمون نگاری کی صنف نے سنجیدہ مضامین علمی و ادبی مضامین، طنزیہ و مزاحیہ مضامین، انقلابی مضامین، صحافتی مضامین، جمالیاتی مضامین، ادب لطیف، تاریخی اور مذہبی مضامین کی حیثیت سے ترقی کی۔ نئے دور کے تقاضوں کے مطابق اس صنف نثر کے موضوعات میں بھی ہمہ گیر اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

Scanned by CamScanner

مضمون

قدیم اُردو (دکنی) میں نیچرل شاعری

از:۔ نصیرالدین ہاشمی

نصیرالدین ہاشمی (۱۸۹۵ء۔۱۹۶۴ء) حیدرآباد کے ایک نوائط خاندان سے تھے۔منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد دفترِ دیوانی میں ملازم ہوگئے اور ترقی کرتے کرتے رجسٹرار کے عہدے تک پہنچے۔وہ قدیم اُردو کے مشہور محقق تھے۔دکنی زبان،ادب اور کلچر ان کے پسندیدہ موضوعات تھے۔حیدرآباد اور یورپ کے کتب خانوں میں دکنی مخطوطات کو تلاش کیا اور ان کے متعلق تحقیقی معلومات فراہم کرکے انہیں کتب خانہ آصفیہ اور یورپ میں دکنی مخطوطات کے نام سے شائع کیا ہے ان کی دیگر مشہور تصانیف یہ ہیں۔''دکن میں اُردو''،''قدیم دکنی کے چند تحقیقی مضامین''اور''دکنی کلچر''ذیل کا مضمون''قدیم دکنی کے چند تحقیقی''مضامین سے لیا گیا ہے۔✪✪

اگر ہم دکنی زبان کے ادبی کارناموں کو ذہن میں رکھیں تو ہمیں یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ اُردو زبان نے اپنے ابتدائی دور میں بھی کتنی ترقی کی تھی۔اس مضمون میں نصیرالدین ہاشمی نے اس عام غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو ادب میں منظر نگاری انگریزی کے اثر سے آئی ہے۔انہوں نے سلطان محمد قلی قطب شاہ،نصرتی اور علی عادل شاہ شاہیؔ کے کلام کی روشنی میں تفصیل سے بتایا ہے کہ دکھنی شاعری موضوعات کے اعتبار سے کس قدر وسیع اور متنوع تھی،اگرچہ یہ زبان موجودہ اُردو کے مقابلے میں کافی مشکل ہے لیکن محض اس بناء پر اس کی ادبی قدر و قیمت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا،اس لیے مصنف نے بجا طور پر کہا ہے کہ''ہم ابتدائی زمانے کی ادبی کوششوں کی احسان مندی سے بھی سبکدوش نہ ہوسکیں گے''۔

اُردو شاعری کے متعلق یہ عام خیال ہے کہ اس میں نیچرل امور کی ترجمانی اور فطرت کے

عنوانوں پر خیال آرائی مغربی شاعری کے اثر سے ہوئی ہے اور یہ مغربی مضراب ہی کا ایک سُر ہے جو اُردو شاعری کے بَربَط سے نکل رہا ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اُردو کی جدید شاعری کے متعلق یہ خیال بڑی حد تک صحیح بھی ہے لیکن قدیم اُردو شاعری کے متعلق یہ رائے صحیح نہیں ہوسکتی کیونکہ دکنی میں نیچرل شاعری کا وجود اس وقت سے ہے جب کہ مغربی شاعری سے کوئی واقف بھی نہیں تھا اور نہ مغربی شاعری کے اثرات شروع ہوئے تھے۔

فطری شاعری یا نیچرل شاعری، مناظرِ قدرت پر خیال آرائی اور وصف نگاری کا نام ہے۔ مناظرِ قدرت میں جذبہ انگیز چیزیں شامل کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً چاندنی، برسات، بہار، جنگل، پہاڑ، پھول پھل، چرند وپرند وغیرہ۔ جب شاعر، ان میں سے کسی کے متعلق اظہارِ خیال کرے تو اس کو منظر نگاری کہا جائے گا۔ وصف نگاری میں، موجوداتِ عالم کی حقیقت اور ان کے مخصوص اوصاف نمایاں کیے جاتے ہیں اس میں مصنوعی چیزیں مثلاً باغ کی آرائش وزیبائش، کسی جلوس یا دربار کی صراحت، برات اور رسومات وغیرہ کا تذکرہ ہو تو اس کو وصف نگاری سے موسوم کیا جاتا ہے۔

دکنی زبان کی شاعری کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں منظر نگاری کئی طرح سے ہوئی ہے۔ مثلاً موسم (بارش، گرمی، سردی) بہار، بسنت، نو روز، عیدین، رسوماتِ شادی بیاہ، کھیل تماشے وغیرہ کے متعلق بھی نظمیں دستیاب ہوتی ہیں۔ جن سے شعرا نے منظر نگاری اور وصف نگاری کے متعلق زیادہ خیال آرائی کی ہے، یہاں ان کی کسی قدر صراحت کی جاتی ہے۔

قدیم اُردو یا دکنی شعراء میں سلطان محمد قلی قطب شاہ ایک ایسا شاعر ہے جس میں منظر نگاری و وصف نگاری کے موضوع پر بہت زیادہ اپنے طائرِ خیال کو پرواز دی ہے۔ اس کے کلیات میں کئی نظمیں نیچرل شاعری کی حیثیت سے ممتاز ہیں۔ اس نے نیچر کے متعدد امور کو جولان گاہ بنایا ہے اور طرح طرح سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ جن جن موضوع پر اس نے طبع آزمائی کی ہے وہ یہ ہیں۔ موسمِ زماں، سرما، بسنت، نوروز، ہلالِ عید، ترکاری، پھول پھل، سالگرہ، رسمِ جلوہ، دیگر رسوماتِ شادی بیاہ، شبِ معراج، عیدِ رمضان، عیدِ غدیر، عیدِ اضحیٰ، مولودِ نبیؐ، چوگان بازی وغیرہ۔

Scanned by CamScanner

دکن میں اگر چہ موسمِ بہار نہیں ہوتا۔ مگر موسمِ بارش ہی یہاں کا زمانۂ بہار ہے۔ دکن میں نہ تو بنگال اور آسام اور سواحل ملیبار کی طرح کثرت سے بارش ہوتی ہے اور نہ بعض اضلاع مدراس و راجپوتانے کی طرح اس کی کمی ہے۔ اس افراط وتفریط کے نہ ہونے کی وجہ سے موسمِ بارش، نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ نہریں، ندی، نالے بہنے لگتے ہیں۔ جنگل اور بیابان تازگی اور شادابی کا ایک ایسا منظر پیش کرتے ہیں جو نشاط افزا اور سرور انگیز ہوتا ہے چوپائے اور جاندار، غذا اور پانی کی افراط کے باعث تنومند ہو جاتے ہیں۔ باغوں میں رنگ رنگ کے پھول بہار دینے لگتے ہیں۔ غرض کہ موسمِ بارش دکن میں دامانِ باغباں اور کفِ گل فروش کے لیے اپنی نمود ونمائش کا سامان مہیا کرتا ہے۔

سلطان محمد قلی نے اپنی کئی نظموں میں موسمِ بارش کا تذکرہ کیا ہے اور مختلف انداز سے اس نے اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ سلطان کی ان نظموں سے نہ صرف منظر نگاری کا کمال ظاہر ہوتا ہے بلکہ اس وقت کی معاشرت اور تمدن کے متعلق بہت ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ان نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان بہت دھوم دھام سے ایک جشن مناتا تھا۔ مُطر بانِ خوش نوا، نغمہ طرازی کرتے، رقص وسرود کے کمالات دکھائے جاتے، باغوں میں جھولے ڈالے جاتے۔ شاہی بیگمات، بیر بہوٹیوں کے رنگ کے سرخ کپڑے زیب تن کرتیں، مشک، زعفران، عنبر مل کر حسینانِ جہاں جھولا جھولتیں اور شاہی قصر اور ایوان میں زمردی رنگ کی مسندیں بچھا دی جاتیں۔ موسم بارش اور آغازِ بارش کے متعلق سلطان محمد قلی کی سولہ نظمیں ہیں جن میں اس نے مختلف نہج سے اپنے طائرِ خیال کو پرواز دی ہے۔ بسنت وہ تہوار ہے جس کو ہندو موسمِ بہار کے آغاز پر مناتے ہیں، ہندوستان میں بہار کا موسم وسطِ مارچ میں سمجھا جاتا ہے، جب پھولوں کی کثرت ہوتی ہے۔ سلطان محمد قلی اس تقریب کو نہایت کر وفر اور شان دار طریقے پر مناتا تھا، بسنت کے متعلق اس کے کلیات میں چودہ نظمیں ہیں جو رنگینی اور برجستگی کے لحاظ سے خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں۔ ان نظموں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسنت کے موقع پر قصرو ایوان اور باغوں میں پھولوں کے انبار جمع کر دیئے جاتے، حوضوں کو رنگوں سے بھر دیا جاتا اور دل کھول کر

Scanned by CamScanner

رنگ کھیلا جاتا۔ سلطان محمد قلی کو پانی، سبزہ اور روشنی سے بڑی دلچسپی اور محبت تھی۔ شب برات کے متعلق بھی اس نے دل کھول کر اپنی طباعی کی جولانی دکھائی ہے۔ شب برات کے عنوان پر اس کی دس نظمیں ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شب برات میں کثرت سے روشنی کی جاتی اور آتشبازی چھوڑی جاتی۔

سلطان محمد قلی نے اپنے شاہی ایوانوں اور باغوں مثلاً خداداد محل، محلِ کوہِ طور، سجن محل، اعلیٰ محل، باغ محمد شاہی وغیرہ پر کئی نظمیں کہی ہیں۔ قصر و ایوان کی شان دار عمارات، ان کی شان وشوکت، باغوں کی سرسبزی وشادابی، پانی سے لبریز حوض، پھولوں سے لدے ہوئے درخت، انواع واقسام کے میوؤں، ترکاریوں وغیرہ پر خوب دادِ سخنوری دی ہے۔

دکن کا دوسرا زبردست شاعر جس کے کلام میں ہمیں نیچرل شاعری کے عمدہ نمونے دستیاب ہوتے ہیں وہ بیجاپور کا ملک الشعراء نصرتی ہے اس کی تصانیف گلشنِ عشق، علی نامہ اور تاریخِ اسکندری، نہ صرف واقعہ نگاری کا اچھا نمونہ ہیں بلکہ اگر ان پر نیچرل شاعری کی حیثیت سے بھی نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نصرتی نے وصف نگاری اور منظر نگاری کا بھی بہترین سرمایہ فراہم کیا ہے۔

اس کی مثنوی ''گلشنِ عشق'' میں باغ کا منظر، صبح کا سماں، چاندنی کی کیفیت، کشتی کی روانی، سردی کا حال، تمازتِ آفتاب وغیرہ کی کیفیت جس طرح واضح کی ہے وہ منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہے نصرتی کا دوسرا شاہکار ''علی نامہ'' ہے۔ جو ایک تاریخی اور رزمیہ مثنوی ہے لیکن اس میں بھی نیچرل شاعری کا بہت اچھا ذخیرہ بدست ہوتا ہے۔ اس میں نصرتی نے بادشاہ کی تخت نشینی کے جشن، شہر کی آرائش و زیبائش، رعایا کی خوشحالی کا بیان نہایت خوبی سے کیا ہے۔ ایک قصیدے میں موسمِ سرما کی حالت بیان کی ہے۔ سردی کی شدت، موسم کی کیفیت، باغوں کی حالت اور گل وگلشن کی پژمردگی کا حال جس قابلیت سے کھینچا ہے وہ نصرتی کی اعلیٰ قابلیت پر دال ہے۔ علی عادل شاہ کو جب صلابت خان پر پوری طرح کامیابی حاصل ہوئی اور بادشاہ نے فیروزی جشن منایا تو نصرتی نے اس موقع پر جو قصیدہ پیش کیا ہے۔ وہ بھی وصف نگاری کی حیثیت سے قابلِ ستائش ہے۔ شہر کی آراستگی، آئینہ بندی، دکانوں کی آرائش وزیبائش، لوگوں کی

Scanned by CamScanner

مسرت وشادمانی، گھر گھر خوشی کے جلسوں کا ہونا، چراغوں کی کثرت سے رات کا شب ماہتاب بن جانا۔ ہزاروں آدمیوں کا بادشاہ کی سواری کے لیے منتظر بیٹھنا۔ جدھر دیکھو آدمیوں کا سمندر معلوم ہونا۔ ان میں خورد وکلاں، جوان بوڑھے، مرد اور عورت سب کا شامل ہونا۔ ان تمام واقعات کی نہایت عمدہ وصف نگاری کی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ یہ زندگی جاوید کا مستحق ہے۔ اس طرح نصرتی نے ملیبار کی فتح پر جو قصیدہ پیش کیا ہے اس میں جس خوبی سے باغ کی تعریف وتوصیف ہے وہ منظر نگاری کی حیثیت سے قابلِ تعریف ہے۔ نصرتی نے علی نامہ میں جنگ کے واقعات اور حالات اس خوبی سے نظم کیے ہیں کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس نے واقعہ نگاری کا بہترین نمونہ اپنی مثنوی میں پیش کیا ہے۔

علی عادل شاہ شاہی وہ دوسرا تاجدار ہے جس نے منظر نگاری اور وصف نگاری کا سرمایہ چھوڑا ہے، اگر چہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی طرح شاہی کے دیوان میں نظمیں نہیں ہیں۔ مگر قصائد وغیرہ میں منظر نگاری کا سرمایہ چھوڑا ہے۔ شاہی کا ایک قصیدہ علی داد محل کے عنوان پر ہے۔ اس طویل قصیدے میں اس نے وصف نگاری کا بڑا اچھا نمونہ پیش کیا ہے، باغ میں قسم قسم کے پھولوں کے تختوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے کئی پھولوں کے نام گنائے ہیں۔ چنبیلی، جوہی، گلاب، سیوتی غرض کہ بیسیوں نام بتائے ہیں۔ اس طرح باغ کے بیسیوں درختوں کو سَر وشمشاد کی بہار اور دوسری طرف میوؤں کے درختوں کی اقسام بیان کی ہیں اور اچھوتی تشبیہوں سے ان کا بیان کیا ہے۔

قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کے دوسرے شعرا جنہوں نے ایک سے زیادہ مثنویاں لکھی ہیں۔ ان میں جا بجا منظر نگاری اور وصف نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ ان کی مثنویوں میں صبح، شام، طلوعِ آفتاب، رات، تاریکی، جنگل، موسمِ بہار، محل، باغ، پھول اور پھل وغیرہ پر جو اظہار خیال ہوا ہے وہ نیچرل شاعری کا نہایت عمدہ اور کارآمد سرمایہ ہے۔

قطب شاہی دَور کے بعد مغلیہ زمانہ آتا ہے، جب کہ عالمگیر کے عہد میں بھی دکنی زبان کی شاعری رائج رہی اور اس زمانے کے شعراء نے بھی اپنے پیش رَو شعراء کی مثنویاں لکھی ہیں، مگر اس زمانے

Scanned by CamScanner

میں عشقیہ یا رزمیہ مثنویوں کی بجائے زیادہ تصوف، اخلاق اور سیرت نبیؐ کے متعلق مثنویاں لکھی گئی ہیں۔
ولی اس دور کے آخری شاعر ہیں جنہوں نے مثنویوں کے قدیم طرز کو چھوڑ کر غزلوں میں اظہار خیال کا طریقہ رائج کیا اور ان کے بعد ہی غزل گوئی پروان چڑھی۔ ولی نے بھی وصف نگاری کا ایک نمونہ چھوڑا ہے چنانچہ انہوں نے سورت کے متعلق جو نظم کہی ہے وہ وصف نگاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ قدیم اُردو میں نیچرل شاعری کا بہت کچھ ذخیرہ موجود ہے۔
ہمارے شعراء نے نیچرل شاعری کی حیثیت سے بھی کافی بلند پایہ اور عمدہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے کلام میں تخیل کی پرواز، اُسلوب بیان کی جدّت، تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت، قابلِ داد ہے ان کی جودتِ طبع، ان کی رسائی ذہن اور ان کے بلند پایہ افکار، ہر حیثیت سے مستحق ستائش ہیں۔ اس زمانے کی زبان، آج کل کی زبان کی بہ نسبت زیادہ شستہ اور رواں نہیں تھی لیکن چاہے ہماری زبان آگے چل کر اور زیادہ شستہ اور ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے اور چاہے آئندہ ہماری زبان اور زیادہ نازک اور دقیق مطالب کی مخزن کیوں نہ بن جائے۔ ہم ابتدائی زمانے کی ادبی کوششوں کی احسان مندی سے کبھی سبکدوش نہ ہوسکیں گے۔

Scanned by CamScanner

طنز وظرافت

طنز Satire اور ظرافت Humour کو صنف کی حیثیت سے نہیں بلکہ ذریعۂ اظہار کا درجہ حاصل ہے۔ جو نہ صرف شاعری میں بلکہ نثر نگاری کے دوران بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے ساتھ ساتھ طنزیہ اور مزاحیہ نثر کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو نثر میں طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہی نہیں بلکہ طنزیہ و مزاحیہ ناول، افسانے، ڈرامے، سوانح، خاکے، سفرنامے، خودنوشت سوانح، انشائیے، مضامین اور طنزیہ و مزاحیہ رپورتاژ لکھنے کا چلن بھی عام ہو گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طنز و ظرافت کا تعلق کسی ایک صنف نثر یا شاعری سے نہیں بلکہ اس کے رویے سارے ادب پر محیط ہیں۔ نثر کے ضمن میں طنز و ظرافت کا وجود قدیم دور سے ہی رہا ہے۔ تاہم اُردو نثر میں سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے رسالہ ''اودھ پنچ'' کے توسط سے طنزیہ و مزاحیہ ادب کی بنیاد رکھی اور سب سے پہلے مزاحیہ مضامین، مزاحیہ ناول لکھے اور مزاحیہ خاکے اڑائے گئے۔ جس کے بعد اُردو نثر میں باضابطہ طنز و مزاح کو نثری اور شعری اصناف میں استعمال کیا گیا جس کا سلسلہ آج تک بھی جاری ہے۔ ✪✪

طنز وظرافت کے مختلف انداز

حقیقت کی تلقین کے لیے ایسا اظہار جس میں چبھن کا احساس ہو جو ہنسانے کے ساتھ ساتھ رلانے کی کیفیت کو اجاگر کرے اسے ''طنز'' کہا جاتا ہے۔ زندگی کی ناہمواریوں اور سماج کے اونچ نیچ کے علاوہ بھید بھاؤ کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے جراحی کا کام انجام دینے والا انداز طنز ہے۔ طنز کے ذریعہ زخم پر پھاہا رکھنے کے ساتھ ساتھ جلن کا احساس بھی نمایاں ہوتا ہے۔ طنز کو صدائے احتجاج اور اصلاح کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے خواجہ عبدالغفور نے بتایا ہے کہ ہنسنے ہنسانے کے ساتھ چٹکی لینے کا انداز طنز ہے اور انہوں نے طنز کے مختلف انداز کا ذکر کرتے ہوئے اس کے 21 قسموں کا ذکر کیا ہے جو ۱۔ شگفتہ طنز ۲۔ استہزا ۳۔ خندہ استہزا ۴۔ لایعنی استہزا ۵۔ مذاق ۶۔ عملی مذاق ۷۔ تفنن ۸۔ چبھتا مذاق ۹۔ بدیہہ گوئی ۱۰۔ برجستہ گوئی ۱۱۔ لب بندی

تاریخی جائزہ

اُردو نثر میں طنز و مزاح کی روایت کا آغاز منشی سجاد حسین کے رسالے ''اودھ پنچ'' سے وابستہ قلم کاروں کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ ان کی ادارت میں یہ رسالہ ۱۸۷۷ء سے ۱۹۱۲ء تک جاری رہا۔ اس جریدہ میں ادب، صحافت اور مذہب کے موضوعات پر اظہارِ خیال کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کی طریقوں سے روشناس کروانے کا طریقہ عام رہا اور ''اودھ پنچ'' کی مقبولیت اسی بنیاد پر رہی کہ اس رسالہ نے مذہب بیزاری۔ انگریزی طریقوں کی تقلید اور مشرقی تہذیب اور اخلاق سے بے نیازی کو نشانہ بنا کر مضمون نگاری کا آغاز کیا۔ خود منشی سجاد حسین کے طنزیہ و مزاحیہ ناول ''حاجی بغلول'' اور ''احمق الذین'' اپنی نوعیت کے انفرادی ناول ہیں۔ ''اودھ پنچ'' کے ذریعہ ہی رتن ناتھ سرشار کا ناول ''فسانۂ آزاد'' بالاقساط شائع ہوا۔ جس میں اُردو کا اولین مضحک کردار ''خوجی'' اپنی حماقتوں اور بذلہ سنجیوں سے خوب رنگ جماتا ہے۔ ''اودھ پنچ'' سے وابستہ طنزیہ و مزاحیہ

Scanned by CamScanner

۱۲۔ ٹھٹھا ۱۳۔ مخول ۱۴۔ ہنسی اور قہقہہ ۱۵۔ گلو گیر ہنسی ۱۶۔ چکلس ۱۷۔ اخاہ ۱۸۔ قلقل ۱۹۔ زیر لب تبسم ۲۰۔ جگ ہنسائی ۲۱۔ قلقاری کے نام سے مشہور ہیں

طنز کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ ہنسانے کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اصلاح کے مقصد کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اس طرح طنز ایک مشکل فن ہے جو تلوار کی کاٹ کا درجہ رکھتا ہے جس کے بعد طنز نگار زخموں کے اندمال کے لیے مرہم پٹی کا کام بھی انجام دیتا ہے۔

مزاح یا ظرافت کے ذریعہ صرف اور صرف ہنسنے اور ہنسانے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ زندگی کے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کر کے کبھی خود پر ہنسنا یا پھر دوسروں کے لیے تفریح طبع کا سامان بہم پہنچانا مزاح یا ظرافت کے ذریعے ممکن ہے۔ الفاظ، جملے، فقرے اور چست بندش کے ذریعہ ہی مزاح پیدا نہیں ہوتا بلکہ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور برجستہ گوئی کے ذریعہ مسکرانے اور چہچہانے کی کیفیت پیدا کی جائے تو یہ عمل "مزاح" کہلائے گا۔ مزاح میں لطف اور ذہانت کو دخل ہوتا ہے۔ افسردگی، ملول اور یاس کا انداز مزاح میں شامل نہیں ہوسکتا۔ مزاح اور ظرافت ایک ہی چیز ہے۔ خوش مذاقی، زندہ دلی اور مضحکہ خیز انداز، مزاح اور ظرافت کا دخل ہے۔ پیشہ ور مسخرے، بہروپیے، بھانڈ، نٹ، نقال، بھاٹ اور کنجڑے اپنے عمل اور رویے سے ہنسنے ہنسانے کے مواقع فراہم کرتے تھے۔ دورِ حاضر میں صحافی، ادیب، کارٹونسٹ، کالم نویس اپنے عمل کے ذریعے مزاح کے بہترین نمونے پیش کرتے ہیں۔ مزاح میں مسکراہٹ سے بات آگے بڑھتی ہے تو ہنسی کا مقام آتا ہے، جس کے بعد کھلکھلا کر ہنسنے کا مقام آتا ہے اور جب بات مزید آگے بڑھتی ہے تو ہنسی کا فوارہ چھوٹتا اور قہقہہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مزاح یا ظرافت کے ذریعہ یہی کام مکمل ہوتا ہے اور انسان ہنستے ہنساتے ہوئے زندگی کے بوجھ کو کم کرنے کا اہل بنتا ہے۔

نثر نگاروں کے قافلہ میں پنڈت تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد، منشی جوالا پرشاد برق، پنڈت رتن ناتھ سرشار شامل ہیں۔ جبکہ شاعروں میں اکبر الہ آبادی اور برج نرائن چکبست نے خود کو "اودھ پنچ" کے قلم کاروں میں شامل کیا۔ سرسید سے وابستہ رفقاء کو اُردو کے عناصر خمسہ کہا جاتا ہے تو "اودھ پنچ" کے بعد طنز و مزاح کو فروغ دینے کی روایت کا آغاز ہوا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے دہلی کی ٹکسالی زبان استعمال کرتے ہوئے پر لطف مزاح کی بنیاد رکھی جسے پڑھ کر قاری قہقہہ نہیں لگا سکتا لیکن متبسم ضرور ہوجاتا ہے۔ "مضامین فرحت" کی کئی جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے طنز و مزاح کے امتزاج سے اپنی تحریروں کو وابستہ رکھا۔ ان کی تحریروں میں علی گڈھ کی خوشبو رچی بسی ہے۔ ان کی تصانیف "مضامین رشید"، "خنداں"، "گنج ہائے گراں مایہ۔ ہم نفسانِ رفتہ، آشفتہ بیانی میری اور طنزیات و مضحکات کی وجہ سے طنزیہ و مزاحیہ نثر کو سربلندی حاصل ہوئی۔ احمد شاہ بخاری پطرس نے صرف "مضامین پطرس" کے ذریعہ اُردو طنز و مزاح میں مقام پیدا کیا۔ عظیم بیگ چغتائی کے افسانوی مجموعوں "شریر بیوی"، "کولتار" اور "خانم" کو طنزیہ و ظریفانہ نثر کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔ ملا رغوری "گلابی اُردو" کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں ان کی نثر ناصحانہ انداز میں اصلاح کا حق ادا کرنے کا وصف رکھتی ہے۔ شوکت تھانوی اپنے عہد کے کامیاب طنز و مزاح نگار قرار پائے انہوں نے موجِ تبسم، بحرِ تبسم، سیلاب تبسم اور طوفانِ تبسم کے علاوہ ناول "داماد" تحریر کیا جس میں طنز و ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اسی طرح کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین جیسے قلمکاروں نے اُردو میں طنز و مزاح کی روایت کو مضمون سے آگے بڑھا کر افسانہ، خاکہ، سفرنامہ، خودنوشت کے علاوہ سوانح میں بھی طنز و مزاح کے انداز میں پیش کرنے کی روایت کو مستحکم کیا۔ اس طرح آزادی کے بعد اُردو میں طنز و مزاح کی روایت جس قدر مستحکم ہے اس قدر مقبولیت کسی اور طرز کو حاصل نہیں ہے۔ جو ماہنامہ "شگوفہ" کی رہینِ منت ہے۔

Scanned by CamScanner

طنز و مزاح

مردہ بہ دست زندہ

از:۔ مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ (۱۸۸۳ء ...... ۱۹۴۷ء) اُردو کی طنز و مزاحیہ نثر میں منفرد مقام کے حامل ہیں۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مشن کالج سے بی۔اے کا امتحان کامیاب کیا۔ ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد تشریف لائے اور یہاں کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ان کی تحریروں میں سنجیدگی قائم رہتی ہے لیکن مزاحیہ انداز اپنا اثر دکھاتا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں ڈپٹی نذیر احمد سے استفادہ کیا اور اپنے استاد مرحوم پر مشہور زمانہ کتاب "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی۔ کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی" تحریر کی۔ جسے اُردو میں خاکہ نگاری کی اولین خشت کا درجہ دیا جاتا ہے "دلی کا آخری مشاعرہ" ان کا ایسا مضمون ہے جسے کئی بار اسٹیج کیا گیا اور اس مشاعرہ سے دلی کی مٹتی ہوئی تہذیب کے نقوش اجاگر ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں خوش مذاقی Light Humour کا انداز کارفرما ہے۔ "مضامین فرحت" کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں۔ علمی اور ادبی رنگ کی شوخی کی وجہ سے ان کے مضامین ہنسنے اور ہنسانے پر مجبور کرتے ہیں۔ مزاحیہ مضامین کے علاوہ انہوں نے ادبی مباحث پر بھی قلم اٹھایا ہے لیکن طبیعت کی شگفتگی اور مزاج کی شوخی وہاں بھی گل کھلاتی ہے۔ دلی کی زبان اور محاورات کا کیف ان کے مضامین میں موجود ہے۔ دلی کے لوگوں کی گفتگو کو وہ اپنی تحریروں میں جگہ دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے معاملہ کا لطف بھی پورا ہوتا ہے اور ہنسنے ہنسانے کا موقع بھی فراہم ہو جاتا ہے۔ اُردو طنز و ظرافت کی نثر میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا نام اہمیت کا حامل ہے چنانچہ ان کا ایک مضمون "مردہ بہ دست زندہ" ان کے طنز و مزاح کی نمائندگی کے لیے نصاب میں شامل کیا جارہا ہے۔ ✪✪

زمانہ نے خلوص دلوں سے مٹادیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہرداری نے لے لی ہے۔ نہ اب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیاداری ہی دنیاداری رہ گئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مرگیا

Scanned by CamScanner

ہے۔اب کوئی اپنا بھی مرجائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مرگیا۔ جنازہ کے ساتھ جانا اسب رسما رہ گیا ہے۔صرف اس لیے چلتے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ واہ جیتے جی تو دوستی ومحبت کا یہ دم بھرا جاتا تھا۔ مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مرگیا۔اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔

آیئے میرے ساتھ آیئے کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھادوں۔

یہ لیجئے۔سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔کوئی بڑے شخص ہیں سینکڑوں آدمی جمع ہیں۔موٹریں بھی ہیں۔گاڑیاں بھی ہیں۔غریب بھی ہیں۔امیر بھی ہیں۔بیچارے غریب تو اندر جابیٹھے ہیں۔کچھ پڑھ بھی رہے ہیں۔جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھے ہیں یا دروازہ پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں جو غریب آتا ہے وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔جو امیر آتا ہے وہ ان باہر والوں ہی میں مل کر کھڑا ہو جاتا ہے پہلا سوال یہی ہوتا ہے۔"کیا مر گئے؟ بھئی ہمارے تو بڑے دوست تھے"۔اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔لیجئے تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔اب دنیا بھر کے قصے چھڑے ایک دوسرے سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی۔دفتر کی کارروائیاں دریافت کی گئیں۔ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ کھینچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔یہ دیکھتے ہی دروازہ کی بھیڑ چھنٹ گئی۔کچھ ادھر ہوگئے کچھ اُدھر آگئے آگے جنازہ ہے اُس کے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ابھی چند قدم ہی چلے ہونگے کہ ان ساتھ والوں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی۔اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیوں کر ہوئی۔جن کو پیچھے رہنا تھا انہوں نے چال آہستہ کردی جنھیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے۔غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے۔آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے یا جن کو جنازہ اٹھانے کے لیے اُجرت پر بلایا گیا تھا۔اس کے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے پاس یا تو سواریاں نہ تھیں۔"یا شرما شرمی پیدل" ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔آخر میں وہ طبقہ جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہٹتا اپنی سواریوں تک پہنچ گیا اور اُن میں سوار ہوگیا۔اگر پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدہ دار ہیں تو غرضمندوں سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ایک آیا جھک کر سلام کیا گھر بھر کی

مزاج پرسی کی۔ مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کیے۔ اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹری کی بُرائیاں کیں۔ اگر حکیم کے علاج مرا ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں۔ اور اسی سلسلہ میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے۔ ان سے پیچھا نہ چھٹا تھا کہ دوسرے صاحب آ گئے۔ اور انہوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے شروع کیے غرض اسی طرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گئے۔ یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں۔ اور اب بھی پڑھیں گے اور دوسرے وہ ہیں جو نہادھو کپڑے بدل خاص اسی جنازہ کے لیے آئے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو اپنی وضعداری پر قائم ہیں۔ یعنے نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھیں گے۔ دُور سے مسجد کو دیکھا اور انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی دیوار کسی موٹر۔ یا کسی گاڑی کی آڑ مل گئی۔ یہ وہیں کھڑے ہو گئے۔ اور سگریٹ پی کر یا پان کھا کر انہوں نے وقت گذار دیا۔ ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔ اُدھر نماز ختم ہوئی اِدھر یہ لوگ مسجد کے دروازہ کی طرف بڑھے۔ اُدھر جنازہ نکلا اِدھر یہ پہنچے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔

یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستہ والوں کو سنئے۔ اگر میت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں ہے کہ کون جیا کون مَرا۔ اگر جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دوکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ آئے۔ مرنے والے کا نام پوچھا۔ مرض دریافت کیا اور واپس ہو گئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات و ممات ان ہی کے تفویض کر دیا ہے اور یہ صرف اس لیے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں مرنے والے کا نام خارج کر دیں۔ موٹر نشینوں کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انہی کے لیے بنی ہیں۔ کسی جنازہ کا سڑک پر سے گذرنا ان کو زہر معلوم ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے اور ظاہر ہے کہ رفتار کم ہونے سے پٹرول کا نقصان ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ مر کر ان کے پٹرول کا نقصان کرے۔ شوفر ہے کہ ہارن پر ہارن بجا رہا ہے۔ لوگ ہیں اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ جنازہ ہے کہ ٹیڑھا ترچھا ہو رہا ہے مگر موٹر والے صاحب کی موٹر جس رفتار سے آ رہی ہے اسی رفتار سے نکلے گی اور ضرور نکلے گی۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ

Scanned by CamScanner

قیامت آ ئیگی تو اس کو بھی ہارن بجا بجا کر سامنے سے ہٹانے کی فکر کریں گے۔ خیر کسی نہ کسی طرح یہ تمام مصیبتیں اٹھا کر جنازہ قبرستان میں پہنچ ہی گیا۔

قبرستانوں کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت بنا دیا ہے۔ قبرستان کیا ہے خاصہ ایک جنگل ہے۔ ایک طرف ٹوٹی پھوٹی ایک جھونپڑی پڑی ہے۔ اس میں ایک سقے صاحب۔ اُن کی بیوی۔ دس بارہ بچے۔ پانچ چھ بکریاں۔ ایک لنگڑا ٹٹو۔ دو سو مرغیاں۔ پانچ چھ بلیاں اور خدا معلوم کیا کیا ہلیّات بھرے پڑے ہیں۔ جس حصے میں قبریں ہیں وہاں کی گھانس بڑھ کر کمر کمر ہوگئی ہے۔ دیواروں کو توڑ کر لوگوں نے راستے بنا لئے ہیں۔ نیم۔ پیپل اور خدا معلوم کس کس قسم کے درخت قبروں کے تعویذ اور چبوترے توڑ کر نکل آئے ہیں۔ کوئی قبر دھنس کر کنواں بن گئی ہیں۔ کسی کا تعویذ ہی غائب ہے۔ کسی چبوترہ کی اینٹیں نکل کر جھونپڑی میں خرچ ہوگئی ہیں۔ غرض کس مپرسی نے اس حصہ کی عجیب حالت کر دیہے۔ دوسرا حصہ جس میں قبریں نہیں ہیں وہ کسی قدر صاف ہیں اور کیوں نہ ہو۔ پہلے حصہ کا مُردوں سے تعلق ہے اور دوسرے کا زندوں سے۔ مُردے تو اپنی قبر کی مرمت کرنے یا کرانے سے رہے۔ ان کی جو عزیز ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس فضول چیز پر کون کچھ خرچ کرے۔ جن کی زمین ہے وہ تو روپئے کھڑے کر چکے۔ اب ان کو اس سے کیا تعلق۔ دوسرے حصہ کا صاف رکھا جانا اصول تجارت پر مبنی ہے۔ جب گاہکوں کو گھیرنے کے لیے دوکان دار اپنی ایک ایک چیز جھاڑ پونچھ کر رکھتا ہے تو یہ قبرستان والے اپنی پچاس روپے گز والی زمین کو کیوں صاف نہ رکھیں خریدتے وقت اچھا مال دیکھ لو پھر تم جانو اور تمہارے مردے جانیں۔

میاں سقہ رہتے تو قبرستان میں ہیں مگر ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں اِدھر لوگ قبر پر پھول چڑھا کر گئے اور اُدھر ان کے بچے سب کے سب سمیٹ لائے۔ رات بھر یہ پھول بستر پر رہے۔ صبح باسی پھول لے جا کر پھر قبر پر چڑھا دیئے۔ خیر کیا ہرج ہے؟ زندوں کا کام بھی نکل گیا۔ مُردے بھی خوش ہوگئے۔ اس گھر میں سِل بٹا خریدنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ قبر کے اچھے سے اچھے پتھر پر مصالحہ پیس لیا اگر کچھ دنوں کوئی دیکھنے بھالنے نہ آیا تو پتھر اُکھاڑ جھونپڑی کے پاس لا رکھا۔ بکریاں قبروں پر قلانچیں مارتی پھرتی ہیں۔ مرغیاں کچی قبروں کو کُرید رہی ہیں۔ بچے یا تو چبوتروں پر لوٹ مار رہے ہیں یا

Scanned by CamScanner

تعویذوں کو گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں۔ بچیاں قبروں پر بیٹھی ایڈیاں اور ٹھیکرے بنا رہی ہیں۔ کسی ٹاٹ کی قبر پر چادر پڑی ہے اس پر بی سقنی نے گیہوں سکھانے ڈال دیے ہیں۔ بکری کو ایک اگلی اور ایک پچھلی ٹانگ باندھ کر چھوڑ دیا ہے۔ وہ قبروں میں گھاس چرتی پھرتی ہے۔ اس کے ادھر ادھر پھدکنے سے کسی قبر کی اینٹ گری۔ کسی کا چونا گرا۔ کسی کا پتھر گرا۔ اگر ایسے ہی چار پانچ گھوڑے چھوڑ دیے جائیں۔ تو تھوڑے ہی دنوں میں وہی منظر بن جائے جو زلزلہ کے بعد کانگڑے کا ہو گیا تھا۔ جنازہ قبرستان میں کیا گیا فوج میں ترم بج گیا۔ سقہ کا سارا خانداں اپنا اپنا کام چھوڑ جھونپڑی میں گھسا۔ اور اناج لینے کو برتن لے۔ لائن باندھ کر آ بیٹھا۔ کسی کے ہاتھ میں بے پیندے کا تام چینی کا کٹورہ ہے تو کسی کے پاس ٹوٹی رکابی۔ کسی کے پاس مٹی کا پیالہ ہے تو کسی کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چھاج۔ سچ ہے خدا رزاق ہے۔ قبرستان والوں کو بھی گھر بیٹھے رزق پہنچاتا ہے۔

یہ تو قبرستاں والوں کی حالت ہوئی۔ اب ساتھ والوں کی کیفیت سنئے جنازہ لا کر لب گور رکھدیا گیا ایک آتا ہے قبر کو جھانک جاتا ہے۔ دوسرا آتا ہے جھانک جاتا ہے۔ ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے۔ کوئی مزدوروں کو سست کہتا ہے۔ کوئی پٹاؤ کا نقص بتاتا ہے کوئی قبرستان والے کو برا کہتا ہے جب اس ریویو سے بھی فراغت پائی تو وہ دو تین تین آدمی ایک ایک قبر پر جا بیٹھے۔ چبوترہ کو تخت بنایا۔ اور تعویذ کو گاؤتکیہ اور لگے سگریٹ اور بیڑی کا دم لگانے کسی نے سقے سے چلم بھرنے کی فرمائش کی۔ اُس نے حقہ تازہ کر سُلفہ بھر حاضر کیا۔ حقے مزے لے لے کر پیے جا رہے ہیں ایک دوسرے کی تواضع کی جا رہی ہے۔ سُلفہ پر سُلفہ بھروایا جاتا ہے۔ اور یہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹا جاتا ہے۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ کچھ خدا کی یاد کریں۔ یا ان خفتگان خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں۔

بعض لوگ ہیں کہ گھانس سے بچتے بچاتے قبروں پر کودتے پھاندتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ وہ صاحب ہیں جن کے مرے ہوئے عزیزوں کے آج دن پھرے ہیں۔ یوں تو خدانخواستہ فاتحہ کو کیوں آنے لگے۔ آج شرما شرمی قبرستان میں آ گئے ہیں۔ ''مفت کرم داشتن'' کی صورت ہے۔ چلو فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب کوئی دوسرا عزیز یا دوست مرے گا تو پھر دیکھا جائے گا۔

Scanned by CamScanner

ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں۔ کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو اپنے دوستوں کو بھی آواز دیکر بلا لیا اور بجائے فاتحہ کے دادِ سخن گوئی دی گئی۔ کچھ اپنا کلام سنایا گیا۔ کچھ اُن کا سُنا۔ غرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گذارنے کو نکال ہی لیا۔

جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں۔ اُن کی کچھ نہ پوچھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے اور ہر قبر ایک کانگریس کا اجلاس۔ دنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے۔ دفتر کی کارروائیوں پر بحث ہو رہی ہے افواہوں کی ذرائع اور اُن کی تصدیق و تردید کی جا رہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں۔ وعدے لئے جا رہے ہیں۔ غرض سب کچھ ہو رہا ہے نہیں ہو رہا ہے تو وہ جو ہونا چاہئے اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں۔

خیر خدا خدا کر کے ''خبر آئی کہ قبر'' تیار ہے۔ کچھ تو اُٹھ کر قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ ایک صاحب نے قبر میں اُتر کر گلاب اور عود چھڑکا۔ ایک نے میت کے اوپر کی چادر سمیٹی۔ چادر میں بل دیئے۔ دو صاحبوں نے مٹھے کے سرے پکڑ کر میت کو اٹھایا۔ آٹھ دس نے غل مچایا''۔ سنبھال کے۔ میت بھاری ہے کمر کے نیچے چادر دو۔ ارے میاں اپنی طرف گھسیٹو۔ ہاں آہستہ سے آہستہ سے''۔ اب میت قبر کے منہ تک آ گئی۔ فقیروں یا یوں کہو کہ مفت خوروں کو اناج تقسیم ہونے لگا۔ اور قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے انہوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا۔ کوئی کہتا ہے''ذرا کمر کی چادر کھینچو ارے بھئی اتنا بھی دم نہیں ہے۔ دیکھنا کہیں قبر کا پا کھانہ گرے۔ ہاں ہاں ذرا اور جھکا کر۔ لا الہ الا اللہ۔ میت بھاری ہے۔ ذرا سنبھال کے آہستہ آہستہ بس بھئی بس''۔ کوئی چیخ رہا ہے''۔ مٹھے کے بندھن کھول دو ارے میاں۔ لو یہ ڈھیلا لو۔ سر کے نیچے رکھ کر منہ قبلہ کی طرف تو کر دو۔ واہ بھئی واہ۔ اتنا بھی نہیں آتا۔ ابھی مُنہ پورا نہیں پھرا۔ بس بھئی بس''۔

یہ مختلف فقرے ایک کی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے ہر شخص ہے کہ غل مچا رہا ہے جو بیچارے قبر میں اُترے ہیں وہ پریشاں ہیں کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ بھر حال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست واحباب اس مرنے والے کو پہلی منزل تک پہنچا ہی دیتے ہیں۔ اب پٹاؤ کی نوبت آتی

Scanned by CamScanner

ہے۔اس میں بھی وہی گڑبڑ شروع ہوتی ہے۔کوئی کہتا ہے۔''یہ کڑی نہیں وہ کڑی لو''۔کوئی کہتا ہے ''لاحول ولاقوۃ۔مفت میں سوروپے مار لئے۔اور کڑیاں دیں تو ایسی''۔غرض کوئی کچھ کہتا ہے۔کوئی کچھ اور اسی گڑبڑ میں پٹاؤ بھی ہوجاتا ہے اور مٹی دینے کی نوبت آتی ہے۔مٹی تو ہر ایک دیتا ہے منہ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے۔لیکن یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو پڑھنا چاہیئے وہ پڑھتا بھی ہے یا نہیں۔البتہ لفظ ''منہا'' بہت اونچی آواز میں کہا جاتا ہے اور باقی سب الفاظ منہ ہی منہ میں ختم کردئے جاتے ہیں جب اِس کام سے فراغت پائی اور قبر تیار ہوگئی تو فاتحہ کی نوبت آئی۔ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس میں شریک نہ ہو۔ہونٹ تو سب کے ہلتے ہیں مگر شاید سو میں بیس بھی نہ ہوں گے جو یہ جانتے ہوں کہ فاتحہ میں کیا کیا سورتیں پڑھتے ہیں۔فاتحہ پڑھتے ہی سب کو اپنے اپنے گھر جانے کی سوجھی۔یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزہ کون ہیں اور ان کی کیا حالت ہے۔ہاں ان بیچاروں کو گھیرتے ہیں تو جنازہ لانے والے مزدور گھر سے چکا کر لائے تھے مگر یہاں آکر وہ بھی پاؤں پھیلاتے ہیں۔کبھی تو کہتے ہیں کہ ''فاصلہ بہت تھا'' کبھی کہتے ہیں کہ ''آپ کی وجہ سے دوسری میت کو چھوڑ کر آئے ہیں۔وہاں آپ کے ہاں سے دگنا مل رہا تھا''۔بہرحال ان مصیبت زدوں کو دق کر کے یہ مزدور کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔

دیکھ لیا آپ نے اس زمانہ کی میت کا رنگ۔جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں؟اب سوائے اس کے کیا ہوں کہ خدا سے دعا کی جائے کہ اللہ اپنے ان بندوں کو نیک ہدایت دے،ان کے دل میں درد پیدا کرے۔یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں؟اور ہم کیا کر رہے ہیں۔✪✪

Scanned by CamScanner

رپورتاژ

اطالوی زبان سے فرانسیسی اور پھر فرانسیسی سے انگریزی میں رائج ہونے والے لفظ Reportage کو اُردو کے ادیبوں نے رپورتاژ کی حیثیت سے قبول کیا۔ کسی جلسہ، محفل، مشاعرہ، تقریب کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنا جس میں چھوٹی چھوٹی باتیں یعنی جزئیات پر بھی خصوصی توجہ دی جائے تو ایسی تحریر ''رپورتاژ'' کہلاتی ہے۔ رپورٹ یا روداد اور رپورتاژ میں بنیادی فرق یہی ہے کہ روداد میں واقعہ کے بارے میں سیدھے سادھے انداز کے ذریعہ معلومات فراہم کردی جاتی ہیں۔ جیسے صحافت کی رپورٹ کے ذریعہ کسی حادثے، فساد، مفاہمت، جنگ بندی، لڑائی اور تعلقات کی استواری کی تفصیلات پیش کی جائیں تو واقعات کی تفصیل رپورٹ یا روداد کہلاتی ہے جبکہ رپورٹ میں زبان و بیان کی لطافت، اظہار کی چاشنی اور جزئیات کو تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا جاتا۔ اس طرح رپورٹ اور رپورتاژ میں بنیادی فرق واقعات کی تفصیل اور ظہور پذیر ہونے والے جلسہ، محفل یا تقریب کے بیان میں جزئیات اور ادبی انداز کو شامل کرنا ہے۔ اسی خوبی کی وجہ سے رپورتاژ کسی ناول یا افسانے کے بیانیہ کے قریب ہو جاتا ہے۔ غرض ادبی محفل، جلسہ، مشاعرے، کانفرنس، شادی بیاہ اور دوسری تقریبات کا زبان و بیان کی چاشنی کے ساتھ بیان ''رپورتاژ'' کہلاتا ہے۔ رپورتاژ نگاری میں جزئیات پر خصوصی توجہ دینا اور بات سے بات پیدا کر کے رپورتاژ میں تسلسل اور فن کی باریکی کو شامل کرنا ضروری ہے۔ ✪✪

فنی جائزہ

رپورتاژ کے اجزائے لازم پانچ ہیں جن کے تحت کسی محفل کا ۱۔ آنکھوں دیکھا حال ۲۔ سرگرمیوں کا احاطہ ۳۔ منظری رویہ اور ۴۔ ہلکے پھلکے طنزیہ پیکر کا سہارا لیا جاتا ہے جسمیں ۵۔ جزئیات نگاری کی شمولیت ضروری ہے۔ کسی بھی کامیاب رپورتاژ میں ۱۔ پیشکش کا حسن ۲۔ واقعاتی عمل ۳۔ تفصیل و تعبیر ۴۔ زبان و بیان کی تخلیقی فضا ۵۔ صحافتی عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں خبریہ حصہ کا دخل اور روداد کی صلاحیت کارفرما ہو تو اسے ''رپورتاژ'' کے فن کی خوبی قرار دیا جائے گا۔

تاریخی پس منظر

اُردو میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر رپورتاژ نگاری کی شروعات ہوئی۔ ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنسوں، میٹنگوں اور ان کی نشستوں کی دل آویز اور دلچسپ انداز سے رپورٹیں لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس کی وجہ سے اُردو میں رپورتاژ کی صنف کا آغاز ہوا۔ چونکہ رپورتاژ میں جزئیات کی پیشکشی کسی ناول یا افسانے کے بیان کی طرح ہوتی ہے اور اس صنف کے ذریعے زبان و بیان کی چاشنی، اظہار کی برجستگی اور الفاظ کے دروبست کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس لیے رپورتاژ کی صنف میں دوسری غیر افسانوی نثر کے مقابلہ میں زیادہ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور اس صنف کے انداز بیان سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اُردو میں باضابطہ رپورتاژ نگاری کا آغاز ۱۹۴۰ء میں سجاد

ایک رپورتاژ نگار کو آنکھوں دیکھا حال دلچسپ پیرائے میں بیان کرنا ضروری ہے۔ اس بیان کے دوران تجربات اور مشاہدات کو کام میں لاتے ہوئے سرگرمیوں کا احاطہ لازمی ہے۔ کسی فلم کے شاٹ کی طرح رپورتاژ نگار کو جزئیاتی خصوصیات کو منظری رویے کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ رپورتاژ نگار اپنے مشاہدے کو کام میں لاکر جزئیات کو مناسب انداز سے پیش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور اسے پیشکش کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے صحافتی عمل، خبریہ حصہ کا دخل اور روداد کی صلاحیت سے استفادہ کرنا ضروری ہے تب کہیں صنفی اعتبار سے ''رپورتاژ'' کی تکمیل ممکن ہے۔ اس کام کے لیے پہلے سے منصوبہ بندی، نشانہ کا تعین اور ہدف کی وضاحت لازمی ہے۔ یہی وہ عوامل ہیں جن کی تکمیل سے ''رپورتاژ'' کی تخلیق ہوتی ہے۔ کسی بھی طرح کی ہنگامی کارروائی یا تحریک کی تفصیلات کو رپورتاژ میں جگہ دی جاتی ہے۔ جنگ، حادثات، فسادات، تہذیبی جلسے، علمی وادبی تقاریب، مشاعرے، سیمینار، سمپوزیم، شعری ونثری نشست یا پھر انفرادی واجتماعی جلسوں کی رپورٹ کو خوشگوار انداز میں زبان وادب کی چاشنی کے ساتھ پیش کرنا ''رپورتاژ'' کی دلیل ہے۔ یہ ایک غیر افسانوی صنف نثر ہے لیکن اس صنف میں تخلیق کاری کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور موقع بہ موقع تفصیلات بیان کرکے افسانویت کی خصوصی کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُردو کے بیشتر کامیاب رپورتاژ ایسے ادیبوں کی جانب سے لکھے ہوئے ہیں جو کہانی نویس، ناول نگار یا افسانہ نویس یا پھر کامیاب صحافی گذرے ہیں۔

ظہیر کے لکھے ہوئے رپورتاژ ''یادیں'' سے ہوا۔ جب ۱۹۴۵ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہوئی تو اس کی روداد کرشن چندر نے ''پودے'' کے نام سے لکھی جو ممبئی کے ہفتہ وار اخبار ''نظام'' میں بالاقساط شائع ہوئی اور بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ اس تفصیل کے مطابق سجاد ظہیر کی تصنیف ''یادیں'' کے بعد کرشن چندر کی تصنیف ''پودے'' کو اُردو کا دوسرا رپورتاژ کہا جائے گا۔ چونکہ رپورتاژ میں پرکشش انداز کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس لیے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو اخباری یا صحافتی رپورٹ کو پرکشش بنا کر اسے رپورتاژ کے درجے تک پہنچانے کی سب سے پہلی کوشش محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے انجام دی۔ انہوں نے ۱۸۳۷ء سے ۱۸۴۰ء کے دوران اپنے اخبار میں جو رپورٹیں شائع کیں ان میں روداد سے زیادہ رپورتاژ کا انداز غالب ہے اسی لیے اُردو میں رپورتاژ کی روایت غدر سے پہلے شروع ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ جس کے بعد رپورتاژ کا انداز عبدالحلیم شرر کے مشہور زمانہ رسالہ ''دلگداز'' میں شائع شدہ وہ رپورٹ ہے جو انہوں نے انجمن دارالسلام کے جلسہ کی رپورٹ منعقدہ ۹/مئی بروز یکشنبہ ۱۸۸۷ء تحریر کرکے شائع کی تھی جو اپریل ۱۸۸۸ء کے دلگداز کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔ محمد حسین آزاد نے ملکہ وکٹوریہ کی دہلی میں تاجپوشی کی تقریب کی جو روداد پیش کی ہے اس میں بھی رپورتاژ کا انداز موجود ہے۔ نیاز فتح پوری نے ممبئی کے سفر کی روداد شائع کی۔ اس تحریر میں بھی رپورتاژ کا عکس جھلکتا ہے۔ مُلّا رموزی کی تحریروں میں بھی رپورتاژ کا انداز نمایاں ہے۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے بعد اُردو میں رپورتاژ نگاروں کا قافلہ تیز ہوگیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ بیشتر نثر نگاروں نے رپورتاژ لکھے۔ جن میں کرشن چندر (پودے صبح ہوتی ہے) پرکاش پنڈت (کہت کبیرا سنو بھئی سادھو) عصمت چغتائی (ممبئی سے بھوپال تک) صفیہ اختر (ایک ہنگامہ) عادل رشید (خزاں کے پھول) فکر تونسوی (چھٹا دریا) ابراہیم جلیس (دو ملک ایک کہانی) خدیجہ مستور (پو پھٹے) جگن ناتھ آزاد (پشکن کے دیس میں) خواجہ احمد عباس (سرخ زمین اور پانچ ستارے) ممتاز مفتی (لبیک) ڈاکٹر علی احمد فاطمی (سفر سے شرط اور جڑیں اور کونپلیں یا مزاج،) اُردو کے اہم رپورتاژ میں شامل ہیں۔

Scanned by CamScanner

کل ہند کانفرنس

از:۔اظہاراثر

ترقی پسند تحریک سے وابستہ اُردو کے ادیبوں میں اظہاراثر افسانوی نثر کی وجہ سے شناخت رکھتے ہیں انہوں نے سب سے پہلے اُردو نثر میں ''سائنس فکشن'' کی بنیاد رکھی ان کا سلسلہ وار شائع شدہ ناول ''ستاروں کے قیدی'' کو سائنس فکشن میں شمار کیا جاتا ہے۔ناول نگاری کو جدید حقیقتوں سے وابستہ کرنے والے ترقی پسند ادیبوں میں اظہاراثر اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔عملی زندگی میں انہوں نے ادب اور صحافت کو اختیار کیا اور فکشن کے بڑے ادیبوں میں منفرد مقام حاصل کیا۔حقیقت پسند ناول کی بنیادیں بھی اظہار اثر کی کہانیوں سے مستحکم ہوتی ہیں۔انہوں نے سماج، معاشرے اور انسانی زندگی کی تصویریں پیش کرکے ناول کو زندگی سے قریب کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ان کے ناول حقیقت سے تعلق نہیں رکھتے لیکن ناولوں کے کردار اور ان کے عمل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اظہاراثر نے حقیقت نگاری کو ناول میں پیوست کرکے اظہار کے نئے رویے کو اختیار کیا۔ کئی ناولوں کے خالق ہیں اور ان کے افسانوی نثر کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔✪✪

اور آخر ہندوستان کی دلہن دلی کا دل ۱۷/ اپریل ۷۶ء کو جگمگا اٹھا۔دلی کا یہ دل جدید و قدیم تہذیبوں کا گنگا جمنی سنگم بستی نظام الدین کا علاقہ ہے جہاں ایک طرف عالیشان ماڈرن کوٹھیاں ہیں تو دوسری طرف پرانے طرز کے بنے ہوئے کچے پکے مکانات۔ جہاں یک طرف ہر شام سڑکوں اور پارکوں میں رنگ و نور کا سیلاب امڈ آتا ہے۔ جو پیاسی نظروں اور بیتاب دلوں کی تسکین کا باعث بنتا ہے۔ تو دوسری طرف روحانی فیض حاصل کرنے کے لیے حضرت نظام الدین اولیاء کا مزارِ مبارک ہے۔

دلی کا یہ دل جہاں امیر خسرؔو اور غالبؔ جیسے فنکار اپنی اپنی آخری آرام گاہ میں محوِ خواب ہیں۔ جہاں چونسٹھ کھمبا نام کی پرانی شاندار عمارت ہے۔ وہیں ایک ماڈرن عمارت ''غالب اکیڈیمی'' ہے۔

Scanned by CamScanner

یہی دلی کا دل ہے...... جو آج ایک نئے انداز سے دھڑک رہا ہے جس میں ہماہمی ہے، چہل پہل ہے۔ زندگی رواں دواں نظر آرہی ہے۔ تابناک چہرے، ستاروں کے مانند چمکتی آنکھیں۔ پیار بھرے الفاظ، جملی لوگ ایک دوسرے سے مصافحے کر رہے ہیں، گلے مل رہے ہیں، قہقہے، سرگوشیاں آخر یہ کون لوگ ہیں؟

ان میں سے بہت سے لوگ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہ تھے۔ شاید صرف نام سنا تھا۔ لیکن اب اس طرح مل رہے ہیں جیسے صدیوں سے شناسا ہوں۔

میں سڑک پر کھڑا اس منظر سے لطف لے رہا ہوں۔ ایک صاحب یہ رونق دیکھ کر مجھ سے سوال کرتے ہیں۔ ''آج یہاں کیسا جلسہ ہو رہا ہے؟ میں دیوار پر لگے ایک بینر کی جانب انگلی اٹھا دیتا ہوں۔ جس پر موٹے موٹے لفظوں میں لکھا ہے، ''اُردو کے ادیبوں کی کانفرنس اور سمینار''

سامنے ہی ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر اجمل اجملی اور سردار جعفری بڑے انہماک سے گفتگو میں مصروف ہیں۔ غالب اکیڈمی کے چھوٹے سے دفتر میں ممتاز مرزا رسید بک اور قلم سنبھالے بیٹھی ہیں۔ جو مندوبین سے پانچ سو روپے فی کس فیس وصول کر رہی ہیں اور ڈیلیکیٹ بیج دے رہی ہیں۔ اندر ہال میں عصمت آپا، قرۃ العین حیدر، غلام ربانی تاباں اور کیفی اعظمی باتوں میں منہمک ہیں۔

بھوپال، امروہہ۔ لکھنو، کانپور، مالیگاؤں، بمبئی غرض کہ ہندوستان کے کونے کونے سے مندوبین آئے ہیں۔

ہلچل صرف دلی میں ہی نہیں سارے ہندوستان میں ہے۔ ترقی پسند اذہان میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی ہے۔ ترقی پسند اذہان میں زندگی کی ایک نئی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ ہلچل مخالف صفوں میں بھی ہے۔ کئی دن سے نام نہاد جدید مصنفین سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ ان کے چہروں پر حیرت کے ساتھ خوف و ہراس کے آثار بھی ہیں۔

امریکہ نواز ماہ نامہ ''تحریک'' نے تو ایک ماہ پہلے سے ''شیر آگیا شیر آگیا'' کا غل مچانا شروع کر دیا ہے۔ مخالف صفوں میں یہ خوف و ہراس کوئی حیرت کی بات نہیں۔ یہ تو صرف چند امریکہ نواز لوگ

ہیں خود امریکہ میں تو وہاں کی آبادی کے بہت بڑے حصہ کو کمیونسٹ فوبیا ہے۔ پوری دنیا کی فاشسٹ ذہنیں ترقی پسندوں سے خائف رہتی ہیں۔

وہی ترقی پسند تو ہیں آج بھی نئے سرے سے اپنی تنظیم کرنے کے لیے غالب اکیڈمی میں اکٹھی ہوئی ہیں۔

مندوبین کا اجلاس شروع ہونے کا وقت ہو چکا ہے۔ تاباں ڈائس پر آ چکے ہیں اور مجلسِ صدارت کے ناموں کا اعلان کر رہے ہیں۔

میں بے چینی سے بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ رحمان نیر ایڈیٹر ماہنامہ روبی اور بیسویں صدی نے مندوبین کو فائلیں تقسیم کرانے کی ذمہ داری میرے سر ڈال دی ہے۔ فائلیں آ چکی ہیں لیکن ان کا آدمی ابھی تک پیڈ اور قلم لے کر نہیں آیا ہے۔

مجلسِ صدارت کے ممبر عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر ڈاکٹر محمد عقیل، کیفی اعظمی اور سردار جعفری اور استقبالیہ کمیٹی کے صدر آنند نرائن ملا اسٹیج پر پہنچ چکے ہیں۔ غلام ربانی تاباں، اجمل اجملی سے جنرل سکریٹری کی رپورٹ پڑھنے کو کہہ رہے ہیں۔

چھوٹے سے قد کے ہنس مکھ۔ ہینڈسم اور دل کے بیمار ڈاکٹر اجمل اجملی کس قدر باہمت شخص ہیں ان کے دل میں کام کرنے کی کس قدر لگن ہے۔ چند دن ساتھ رہ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شخص گوشت پوست کا نہیں۔ فولاد کا بنا ہوا ہے۔

رپورٹ پڑھ رہے ہیں۔

اسی وقت مجھے رحمٰن نیر کا چپراسی نظر آتا ہے وہیں بھاگ کر باہر جاتا ہوں۔ فائلوں میں پیڈ اور قلم رکھنے میں کئی رضا کار مصروف ہو جاتے ہیں۔ کچھ رضا کار مندوبین کو ان کی کرسیوں پر ہی فائلیں تقسیم کرنے لگتے ہیں۔ میں ہال میں واپس آنا چاہتا ہوں کہ رئیس مرزا میرا راستہ روک لیتے ہیں۔

رئیس مرزا دہلی کلچرل سوسائٹی کی روح رواں ہیں۔ بیس پچیس سال پہلے کمیونسٹ پارٹی کا سنگنگ اسکواڈ دلی اور قرب و جوار کے علاقوں میں بہت مشہور اور مقبول تھا جس میں رئیس مرزا اور میں شامل تھے۔

آج رئیس مرزا مطبخ کے انچارج ہیں یعنی مندوبین کے قیام وطعام کی ساری ذمہ داری ان کے سر ہے۔ کھانے کے خرچ کی ذمہ داری شہر کے چند ادب دوست اور صاحب استطاعت حضرات نے لی ہے۔ ایک وقت کے کھانے کا بندوبست میرے ایک کرم فرما ع۔ حامد صاحب نے کیا ہے رئیس مرزا مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ حامد صاحب کس دن اور کس وقت کے کھانے کا بندوبست کرسکیں گے۔ میں ان سے وقت طے کرکے ہال میں داخل ہوتا ہوں اس وقت سردار جعفری مندوبین سے مخاطب ہیں وہ کہہ رہے ہیں "ابتدا سے ہی ترقی پسند تحریک اور تنظیم میں مختلف سماجی اور سیاسی نظریات رکھنے والے ادیب شامل رہے ہیں" اس کے اولین معماروں میں اگر ایک طرف پریم چند تھے جو بنیادی طور پر گاندھی وادی اور قوم پرست تھے تو دوسری طرف سید سجاد ظہیر تھے جو کھلے ہوئے اشتراکی تھے۔ تنظیم میں شامل ہونے والے ادیب وہی تھے جو اس کے مینی فیسٹو سے اتفاق رکھتے تھے۔ لیکن تنظیم کے باہر بہت سے ادیب اپنی تخلیقات میں ترقی پسند اقدار پر زور دے رہے تھے"۔

دس پندرہ سال کے تعطل کے بعد تنظیم میں نئی روح پھونکنے کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے سردار جعفری مندوبین کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ تنظیم کی ضرورت اور اس کے نام کے بارے میں اپنی اپنی رائے کا اظہار کریں۔ وہ کہہ رہے ہیں۔

"اگر کل ہند تنظیم اسی نام سے بنائی جائے تو ایسی دوسری انجمنوں کو اس سے الحاق کی اجازت دی جائے جو کسی دوسرے نام سے لیکن ان ہی مقاصد کو سامنے رکھ کر کام کر رہی ہوں"۔

سردار جعفری کی بات کچھ واضح نہیں تھی۔ اس لیے قیصر شمیم، سرفراز عثمان اور میں نے کچھ "اعتراضات" کیے۔

سردار جعفری دوسری بار اسٹیج پر آئے اور اپنی بات کی وضاحت کی۔ اصل بحث کا آغاز قاضی عبدالستار نے کیا۔

چست پاجامہ، بھورے رنگ کی شیروانی، مسکراتی ہوئی آنکھوں پر عینک، پیچھے کو پلٹے ہوئے بال، قاضی عبدالستار ویسے تو بہت خوش مزاج ہیں لیکن اس وقت غصہ میں ہیں۔ ان کا چہرہ تمتایا ہوا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں

Scanned by CamScanner

''مجھے افسوس ہے کہ علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن گذشتہ بیس سال سے سرگرمی سے کام کر رہی ہے۔ لیکن رپورٹ میں اس کا ذکر نہیں اور نہ اسکے بعض اراکین کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے''۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جن اراکین کا ذکر قاضی عبدالستار کر رہے ہیں ان میں ایک خود تاباں صاحب کے صاجزادے ہیں۔ تاباں صاحب قاضی عبدالستار کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور نہایت نرم اور سنجیدہ لہجہ میں ان کے اعتراضات کے جواب دے رہے ہیں''۔

ڈاکٹر قمر رئیس ایک طرف بیٹھے بڑی تیزی سے نوٹس'' لے رہے ہیں۔

ذرا بھاری جسم۔ دراز قد، آنکھوں میں ذہانت کی چمک، دلآویز نقوش کے مالک ڈاکٹر قمر رئیس گذشتہ پندرہ دن سے مسلسل بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں جس کی تھکان چہرہ کی اس تابناکی کی تہہ میں محسوس کی جاسکتی ہے جو کانفرنس کے کامیاب افتتاح کے باعث ان کے چہرے پر چھلک آئی ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر کہتے ہیں۔

''اظہار تمہیں اس کانفرنس کا رپورتاژ لکھنا چاہئے''

''میری خواہش بھی یہی ہے'' میں جواب دیتا ہوں۔

''لیکن میرے سر پر بہت سی ذمہ داریاں ہیں ایسے میں مسلسل نوٹس نہیں لے سکوں گا۔ بعد میں آپ اپنی رپورٹ مجھے دیدیں تاکہ میں اپنی کمی پوری کرسکوں''۔

قمر رئیس مجھے اپنی رپورٹ دکھانے کا وعدہ کر لیتے ہیں۔

ڈائس پر اب مجلس استقبالیہ کے صدر آنند نرائن ملا آچکے ہیں۔ دوسری صف میں احمد جمال پاشا اور ان کی بیگم بیٹھی ہیں۔ احمد جمال پاشا کی تحریروں کے ذریعہ ان سے غائبانہ تعارف ہے اس کانفرنس میں پہلی بار ملاقات ہوئی ہے چھوٹے سے قد اور گورے رنگ کے وجیہ آدمی ہیں۔ خالص لکھنوی انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ نرم نرم دھیمے دھیمے لہجہ میں پائپ کے ساتھ ان کی شخصیت مشرق و مغرب کا سنگم نظر آنے لگتی ہے۔ میں ان کے برابر میں ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ ملا صاحب کہہ رہے ہیں۔

Scanned by CamScanner

"میرے نزدیک اپنے عہد کی قدروں کی ترجمانی کرنے والے ارتقا یافتہ ادب کا نام ترقی پسند ادب ہے۔ اسے بیشک ایک منظم لیکن وسیع تحریک کی صورت دی جائے۔

"ترقی پسند ادب ماضی وحال دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں"۔

"اُردو ادب کی زندگی ترقی پسند ادب سے منسلک ہے"۔

"لیکن وہ فنکار جن کے فکر وفن میں زندگی ہوتی ہے۔ خواہ وہ اس انجمن سے متعلق ہوں یا نہ ہوں کیا ان کو کوئی مار سکتا ہے"۔

"اصل میں اولیت انسانی قدروں کو دینی چاہئے۔ چالیس سال میں ترقی پسند ادب میں تخلیق کم اور مخصوص سیاسی نظریہ کا اظہار زیادہ ہوا ہے تحریک کو سیاسی رنگ دیا گیا ہے۔

"چین کے حملے کے وقت ترقی پسند ادبا نے احتجاجی ادب تخلیق نہیں کیا"۔

ملا صاحب کو اُردو سے والہانہ محبت ہے۔ وہ جج، شاعر اور ممبر پارلیمنٹ ہیں یعنی تین مختلف شخصیتوں کے مالک ہیں۔ لیکن کبھی کبھی جب ان کے اندر کا جج بیدار ہوتا ہے۔ تو وہ بہت جلد فیصلے سنا ڈالتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عقیل، ملا صاحب کی آخری چند باتوں کا جواب دے رہے ہیں۔

جاں نثار اختر کی نظم "ہم ایک ہیں"۔ "چین کے خلاف احتجاجی نظم تھی"۔

لیکن وہ بھی صرف ایک حوالہ دے کر خاموش ہو گئے ہیں جب کہ مجروح کی غزل کا بھی حوالہ دیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ "پاک زمین ناپاک قدم" میں عشرت کرتپوری نے وہ تمام نظمیں اکٹھا کی تھیں جو چین کے خلاف اُردو شعراء نے لکھی تھیں ان میں زیادہ تر ترقی پسند شاعر تھے۔ میری تین صفحات کی طویل نظم بھی اس مجموعے میں شامل ہے۔

ملا صاحب کے دوسرے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے سردار جعفری مائک پر آ گئے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں۔

ملا صاحب کی تقریر قوم پرستی کا جذبہ لئے ہوئے تھی۔ ترقی پسند تحریک کے ایک سرے پر قوم پرستی تو دوسرے سرے پر اشتراکیت ہے اور ان کے درمیان ہزار رنگ۔

Scanned by CamScanner

شعرا اور ادبا کو ایک مرکز پر اکٹھا کرنا ایسا ہی ہے جیسے مینڈکوں کو ترازو میں تولنا۔

''تاہم تحریک کی جدید تنظیم میں ان نکات کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا جن کی طرف ملّا صاحب نے توجہ دلائی''۔

اب مائک پر نیشنل پروگریسو رائٹر فیڈریشن کے جنرل سکریٹری اور ہندی کے مشہور ادیب بھیشم ساہنی آچکے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں

''زندگی اور انسانی قدروں پر ترقی پسند ادب کی بنیاد ہے۔ لہذا سماجی جدوجہد سے ادیب و شاعر کا منسلک ہونا بہت ضروری ہے''۔

''ہمارے بیسویں صدی کے ادب میں تین ادوار ہیں۔ پہلا دور اصلاح پسندی کا دور تھا۔ دوسرا تحریک آزادی کا اور آج کا تیسرا دور ملک میں سماج واد کی تعمیر کا دور ہے۔ اس دور کے بے شمار مسائل ہیں۔ ترقی پسند ادیب جن سے پہلو تہی نہیں کر سکتے''۔

ملا صاحب کے چند اعتراضات نے مندوبین میں جوش و خروشی کی ایک لہر دوڑا دی۔

انیس جلالی شعلہ جوالا بنے مائک پر کہہ رہے ہیں۔

''ملا صاحب نے انسانی قدروں پر زور دیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ انسانی قدریں کیا ہیں۔ کیا وہ تغیر پذیر سماجی نظام سے اور اسکی آویزش سے الگ اپنا کوئی وجود رکھتی ہیں''۔

انیس جلالی نے اس الزام کی بھی تردید کی ہے کہ ترقی پسند ادیب تنگ نظر ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل دوبارہ مائک پر ہیں اور کہہ رہے ہیں۔

''آج کے ادبی اور اجتماعی حالات تیس چالیس سال قبل کے حالات سے بہت مختلف ہیں۔ نئی پود کے ادیب دوسرے ڈھنگ سے سوچ رہے ہیں۔ آج ہمارا مینی فیسٹو ہی ہماری زندگی ہے۔ ترقی پسندی یہی ہے۔ کہ ہم زندگی کو آگے بڑھانے والی قوتوں کا ساتھ دیں''۔

Scanned by CamScanner

کشمیری لال ذاکر اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ترقی پسند ادب کے ساتھ اُردو زبان کی زندگی کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے۔ اُردو زبان کی تعلیم کا نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کو اُردو زبان کی بقا کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔

قرۃ العین حیدر تحریک کی نئی تنظیم سے بہت خوش ہیں۔ گہرے رنگوں کی پھول دار ساڑھی میں ملبوس آنکھوں کے کونوں سے کاجل کی لکیریں جھانکتی ہوئیں، سلیقہ سے لپ اسٹک ہونٹوں پر سجائے وہ کہہ رہی ہیں۔

''آج واضح طور پر اُردو ادب میں دو دھارے ہیں۔ ایک ترقی پسند فکر کا دھارا ہے اور دوسرا بیمار ذہنیت کا دھارا۔ مجھے خوشی ہے کہ ترقی پسند تحریک کی نئے سرے سے تنظیم کی جا رہی ہے لیکن ہمیں تنگ نظری کے رویہ کو ختم کر دینا چاہیے''۔

کوثر چاند پوری بہت نستعلیق شخصیت ہیں جب ملتے ہیں وہی سفید شیروانی، چست پاجامہ اور ہنستا ہوا چہرہ۔ وہی خلوص بھری مسکراہٹ عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہونی چاہیے لیکن چہرہ پر جوانوں جیسا جلال ہے۔ ان کے قلم میں بھی جلال ہے۔ اپنے بچپن سے کوثر صاحب کو پڑھتا چلا آرہا ہوں۔ وہ زمانے کے ساتھ چلنا جانتے ہیں وہ کہہ رہے ہیں۔

''ترقی پسند تحریک ایک ایسا زبردست طوفان تھی جس نے ساری دنیا کے ادب کو متاثر کیا ہے اور آج بھی اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں''۔

کوثر صاحب کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم اسٹیج پر پہنچ چکے ہیں۔ جو لوگ بحث میں حصہ لینا چاہتے ہیں وہ چٹوں پر اپنے اپنے نام لکھ کر مجھ تک پہنچا رہے ہیں اور مجھے بار بار اسٹیج پر جانا پڑ رہا ہے۔ خلیق انجم مائک پر کہہ رہے ہیں۔

''آج ترقی پسندوں کے سامنے یہ سوال ہے کہ ان کا مینی فیسٹو کیا ہو۔ رپورٹ میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ تقریباً وہی ہیں جو کانگریس بھی کہتی ہے''۔ ✪✪

Scanned by CamScanner

عثمانیہ یونیورسٹی

Scanned by CamScanner